جاری کردہ
سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ماہنامہ
ترجمان القرآن

۱۹۹۴

مدیر: خرم مراد

ادارۂ ترجمان القرآن

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر: خرم مراد

جلد ۳۰ | دسمبر ۱۹۹۴ جمادی الثانی ۱۴۱۵ | عدد ۱۲

فہرست مضامین

برائے ادارتی امور

منصورہ ملتان روڈ لاہور ۵۴۵۷۰ فون نمبر ۸-۷۵۷۰۱۲۳ فیکس (۰۴۲) ۷۵۷۴۷۱۹

برائے انتظامی امور

ماہنامہ ترجمان القرآن، ۵۔۱۰ اے، ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور۔

فون نمبر۔ سرکولیشن ۷۵۸۷۹۱۶ انتظامی امور، ۷۵۸۵۵۹۰

زر سالانہ بذریعہ منی آرڈر یا بنک ڈرافٹ ترجمان القرآن لاہور کے پتہ پر ارسال فرمائیں۔

کراس چیک قبول نہیں کیے جائیں گے

قیمت فی شمارہ-/۱۰ روپے، زر سالانہ-/۱۰۰ روپے (اندرون ملک)

مشرق وسطی۔ ۴۵۰ روپے۔ بنگلہ دیش / بھارت ۳۰۰ روپے۔ یورپ / مشرق بعید۔ ۶۰۰ روپے۔ امریکہ / کینیڈا / آسٹریلیا ۷۰۰ روپے۔

سید حسین فاروق مودودی نے ملک عید پرنٹرز لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ، لاہور سے شائع کیا۔

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ اچھرہ لاہور (پاکستان)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

خرم مراد

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی قلیل مدت میں زمانہ جاہلیت کے لوگوں کی ایسی حیرت انگیز اصلاح و تربیت کی کہ ان کی بالکل کایا پلٹ ہو گئی۔ آپؐ نے ان کے اخلاق بدل دیے، ان کو ایک منظم معاشرہ بنا دیا، اور ان کے اندر اتنی استعداد پیدا کر دی کہ وہ دیکھتے دیکھتے مشرق و مغرب کے امام بن گئے۔ یہ عظیم الشان انقلاب کس طرح برپا ہوا؟ اس کا راز، دراصل، اس حکمتِ ربانی اور خلق عظیم میں پوشیدہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو کمال درجہ میں مالا مال کیا تھا۔ ماشاءَ اللہ لاَ قوۃ اِلاَّ باللہ

عوام کی اصلاح و تربیت ہو یا اپنی، اگر ہمیں آج اس مشن کو لے کر آگے بڑھنا ہے تو حضورؐ کی سیرت سے حکمت اور اخلاق کا اکتساب کیے بغیر یہ سفر طے نہیں ہو سکتا۔ حضورؐ سراجِ منیر ہیں، دعوت الی اللہ کی راہ میں آپؐ کی زندگی روشنی کا مینار ہے، اور ہم اس کٹھن راہ پر صرف آپؐ کے نور کی روشنی میں، اور آپؐ کے اسوۂ حسنہ اور تعلیمات کی پیروی کر کے، ہی چل سکتے ہیں۔

حضورؐ کے اخلاق و حکمت کا پورا پورا بیان اور احاطہ کسی کے بس میں نہیں، نہ اس کی پوری پیروی۔ لیکن اس کے بنیادی عنوانات کا جاننا، اور حتی المقدور ان کے مطابق اپنے قول و عمل کو ڈھالنا، ہم سب کے لیے ضروری ہے۔ اور کیوں کہ دعوت کا کام حکمت کے ساتھ کرنے کا حکم سب کو دیا گیا ہے، اس لیے اپنی اپنی ضرورت اور استطاعت کی حد تک حضورؐ کی حکمت کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا، کسی کے بس سے باہر نہیں۔

حکمت و اخلاق کے جن عنوانات کی پابندی کو ہم نے اصلاحِ معاشرہ کے کام کے لیے ناگزیر قرار دیا ہے، وہ سب اسوۂ نبویؐ میں کار فرما دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان کو بار بار پڑھنا اور سننا، ان کو نگاہِ قلب اور چشمِ تصور سے دیکھنا، ان کو اپنے اندر جذب کرنا، اور ان کے مطابق بننے کی کوشش میں لگا رہنا: یہی طریقہ ہے جس کے ذریعہ ہمیں اس نور کا کچھ حصہ نصیب ہو سکتا ہے۔

حضورؐ کی ساری اصلاح و تربیت میں ہمیشہ انتہائی شفقت و محبت اور نرم دلی و نرم روی کی صفات کارفرما اور غالب رہیں۔ آج ہمیں بھی سب سے بڑھ کر اسی کی ضرورت ہے۔ آپؐ رحمت للعالمین تھے، رؤف و رحیم تھے، دل اور برتاؤ کے نرم تھے۔ یہ شفقت اور نرمی آپ کی رحمت ہی کا ثمر تھی۔ دین و ایمان کے تقاضوں اور مطالبات میں، احکام میں، انسانی فطرت اور ضروریات کا جو پورا لحاظ ہے، سہولت اور آسانی کا جو انتہائی اہتمام ہے، انس و رغبت اور تالیفِ قلوب کا جو سامان ہے، اور استعداد و طبائع کے لحاظ سے جو حکیمانہ تدریج و ترتیب ہے، وہ بھی حضورؐ کی رحمت کا نتیجہ ہے۔ تعلیم و تربیت میں جو سوز و دردمندی ہے، شفقت و مہربانی اور نرمی ہے، تادیب میں جو عفو و درگزر اور احتیاط و احتراز کی رَوش ہے، اور عطاء و بخشش سے لے کر برتاؤ اور رَوش تک میں جو فراخ دلی، فیاضی اور سخاوت ہے، وہ بھی اسی رحمت کی مرہون منت ہے۔

حضورؐ کے طریق اصلاح کی حکمت کا ایک بڑا جامع واقعہ سید قطبؒ نے سورۃ الاعلیٰ کی آیت ونیسرک للیسری کی تفسیر کے تحت بیان کیا ہے جو پڑھنے کے لائق ہے:

"ایک بدو رسول اللہؐ کے پاس آیا، اور آپؐ سے کچھ مانگا۔ آپؐ نے اس کی مطلوبہ چیز اسے دے دی، اور پوچھا: "کیا میں نے تم سے اچھا سلوک کیا؟ بدو نے کہا: "نہیں، آپؐ نے مجھ سے اچھا سلوک نہیں کیا"۔ مسلمانوں کو اس پر غصہ آگیا، اور وہ (اسے مارنے کے لیے) بڑھے۔ آپؐ نے انھیں اشارہ سے روک دیا۔

"پھر آپؐ اپنے گھر میں تشریف لے گئے، بدو کو بلا بھیجا، اور اسے کچھ اور عطا کیا۔ پھر اس سے پوچھا: "کہو، کیا میں نے تم سے اچھا سلوک کیا؟" اس نے کہا: "ہاں، اللہ تعالیٰ آپؐ کو اس کی بہترین جزا دے۔ آپؐ بہت اچھے گھر اور خاندان کے ہیں"۔ آپؐ نے کہا: "تم نے اس سے پہلے جو کچھ کہا، اس سے میرے ساتھیوں کے دل پر کچھ اثر ہے۔ اگر پسند کرو تو یہ بات جو تم نے میرے سامنے کہی ہے، ان کے سامنے بھی کہہ دو، تاکہ ان کے دلوں میں تمھاری طرف سے جو رنجش ہے وہ نکل جائے" اس نے کہا: "بہت اچھا!"

"اگلے دن صبح ہوئی تو وہ بدو آیا۔ نبی کریمؐ نے اپنے ساتھیوں سے کہا: "اس نے کل جو کہا سو کہا۔ پھر میں نے اسے اور دیا۔ اب اس کا کہنا یہ ہے کہ وہ راضی اور خوش ہے۔ کیوں بھائی، کیا یہ صحیح ہے؟" بدو نے کہا: "ہاں، اللہ آپؐ کو اس کی بہترین جزا دے۔ آپؐ بہت اچھے گھر اور خاندان کے ہیں"

تب رسول اللہؐ نے فرمایا: "میری اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص کی اونٹنی اس کے

پاس سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ لوگ اس کے پیچھے [ڈنڈا لے کر!] دوڑے، تو وہ اور دور بھاگ گئی۔ اونٹنی کے مالک نے لوگوں سے کہا: "میری اونٹنی کو مجھ پر چھوڑ دو، میں اس پر نرم ہوں اور اس کے مزاج سے واقف ہوں"۔ پھر مالک، کچھ گھاس پھوس لے کر اس کی طرف بڑھا، اور آہستہ آہستہ اسے واپس لے آیا۔ وہ اس کے پاس آئی، اور بیٹھ گئی، تب اس نے اس پر کجاوہ کسا، اور سوار ہو گیا۔ تو اگر میں تمھیں چھوڑ دیتا اور تم اسے قتل کر دیتے تو وہ دوزخ میں پہنچ جاتا"۔

اس ایک واقعہ میں حضورؐ کی رحمت، نرمی، اخلاقِ کریمانہ اور حسنِ تدبیر کے جو ایسے بیش بہا خزانے بکھرے ہوئے ہیں، ان پر غور کیجیے اور ان سے اپنی جھولی بھرنے کی فکر کیجیے۔ اخلاقِ حسنہ و حسنِ تدبیر کے بیش بہا موتی آپؐ کی پوری سیرت میں بکھرے ہوئے ہیں۔

۱۔ آپؐ کی فیاضی و سخاوت کی شان دیکھیے! ایک اجنبی بدو آکر سوال کرتا ہے، جو کچھ پاس ہے آپؐ اسے عطا کر دیتے ہیں۔ آج کی زبان میں، گویا اس کا "کام" کر دیتے ہیں۔ نہ پوچھ گچھ نہ تحقیق۔ یہ ہے امداد کا معیارِ مطلوب۔ آپؐ اجود الناس (سب سے بڑھ کر سخی) تھے۔ اسی سخاوت سے دل کے تالے کھلتے، اور نصیحت کی قبولیت کا سامان ہوتا۔ ایک شخص نے آپؐ سے اتنی بکریاں مانگیں جو ایک وادی بھر دیں، آپؐ نے اتنی ہی دے دیں۔ اس نے اپنی قوم سے کہا: "مسلمان ہو جاؤ، محمدؐ اس طرح دیتے ہیں جیسے انھیں افلاس کا کوئی خطرہ نہ ہو" (مسلم)۔ حنین سے واپسی پر چند بدو مانگنے کے لیے آپؐ سے لپٹ گئے، اور آپؐ کی چادر پکڑلی۔ اس کشمکش میں چادر جسم مبارک سے اتر گئی۔ فرمایا: "میری چادر مجھے دو، اگر میرے پاس ان درختوں کے برابر مویشی ہوتے تو وہ سب تمھارے درمیان تقسیم کر دیتا" (بخاری)۔ مدینہ کی ایک لونڈی بھی آپؐ کا ہاتھ پکڑلیتی اور جہاں چاہتی آپؐ کو اپنے کام کے لیے لے جاتی (مسلم)۔ ایک عورت نے، جس کے دماغ میں خلل تھا، آپؐ سے تخلیہ میں بات کرنا چاہی۔ آپؐ نے فرمایا: "اے فلاں کی ماں، جس کوچہ میں تو کہے میں چلوں اور تیرا کام کر دوں" (مسلم)

۲۔ آپؐ کے صبر و تحمل کا کمال دیکھیے! جس کی مدد کی جس کا کام کیا، وہ ناخوش اور ناراض اور گستاخی پر تلا ہوا، جاں نثار ساتھی اس کو مارنے کے لیے بے چین، مگر آپؐ ان کو روک دیتے ہیں، بلکہ الٹا اس کو اندر لے جاکر اتنا دیتے ہیں کہ وہ خوش ہو جاتا ہے۔ کسی بدلہ اور شکریہ کی طلب کا تو سوال ہی نہیں۔ ایک دفعہ ایک بدو نے آپؐ سے مانگا، آپؐ کے گلے میں چادر ڈال دی، اس کو کھینچنا شروع کیا، یہاں تک کہ گردن مبارک پر نشان پڑ گیا۔ صحابہؓ نے اس کو مارنا چاہا، لیکن آپؐ نے یہاں بھی روک دیا، اور اس کی منہ مانگی مراد پوری کر دی (ابوداؤد)

۳۔ حسنِ تدبیر دیکھیے! صحابہ کی رنجش بھی دور کرتا ہے تاکہ لوگ خوش دلی کے ساتھ ایک جاہل،

بے ادب آدمی کو اپنے درمیان قبول کریں، اور ایسے شخص کی تربیت بھی کرتا ہے۔ چنانچہ اس کو مجلس میں بلا کر اس کے رویہ میں تبدیلی کو سب کے سامنے کھول دیتے ہیں۔

۴ - پھر، تربیت ہی کے لیے، اپنی ایک مثال دیتے ہیں، جو ایک بے نظیر مثال ہے، جس کا ہر پہلو طریق اصلاحِ خلق کی حکمت کے کسی پہلو کو بے نقاب کرتا ہے۔ جو لوگ جاہل تھے، لالچی اور بے ادب تھے، متوحش اور متنفر تھے، جن کے بارہ میں خیال یہ تھا کہ ان پر کلامِ نرم و نازک بے اثر ہے، لاتوں کے بھوت ہیں باتوں سے نہیں مانتے، ان کو اسی طریقہ سے حضورؐ ساتھ ملا لیتے اور بہتر انسان بنا دیتے۔

(۱) آپؐ ان کے مزاج سے واقف تھے۔ ہر مصلح کو ان انسانوں کے مزاج اور ضروریات سے واقف ہونا چاہیے جن کی اصلاح کا بیڑا اس نے اٹھایا ہو، ورنہ وہ ان کو اَور دُور بھگا دے گا۔ آپؐ ان کے لیے نرم تھے۔ غیظ و غضب، سختی و درشتی، ڈانٹ ڈپٹ، اور طنز و تعریض سے مصلح کے جذبات کی تسکین تو ہو جاتی ہے، مگر لوگ اور دور بھاگتے ہیں۔ نرمی سے وہ قریب آتے ہیں، اور پتھر کے دل بھی پانی بن کر بہنے لگتے ہیں۔

(۲) یہ آپؐ کی نرمی کا مظہر تھا کہ بھاگی ہوئی اونٹنی کو چارا دکھایا، گویا آپؐ نے ان چیزوں سے لوگوں کو نیکی کی طرف کھینچا جو ان کے لیے مرغوب تھیں، جن سے وہ مانوس تھے، جن میں ان کے لیے سہولت تھی اور جن کا انھیں لالچ تھا۔ اس پر مستزاد، ان کی مرغوب غذا سامنے رکھنے کے باوجود، آپؐ نے تدریج اختیار کی اور آہستہ آہستہ اپنی طرف لائے۔

آج بھی ایسا ہی رحیمانہ اور حکیمانہ طریق اصلاح، نادان اور متنفر لوگوں کو اس لائق بنا سکتا ہے کہ ان پر "کجاوہ" کَس کے، ان کے ذریعے اسلامی انقلاب کی منزل تک پہنچا جا سکے۔ اس رحمت کے چند اور پہلو بھی اہم ہیں :

حضورؐ تمام انبیا کی طرح، اپنی قوم سے محبت کرتے تھے، نفرت نہیں۔ انکار کرنے والوں سے بھی، اور ساتھ چلنے والوں کے حق میں تو رؤف و رحیم تھے ہی۔ آپؐ نے اپنا سارا کام انتہائی دردمندی اور سوز و آرزو کے ساتھ انجام دیا۔ آپؐ اپنے مخالفین تک کے غم میں گھلا کرتے تھے، ان کے انکار و نفور اور مظالم کے جواب میں غصہ، مایوسی اور بیزاری کا شائبہ بھی آپؐ کے دل یا برتاؤ میں پیدا نہ ہوتا تھا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ بار بار آپؐ کو نصیحت کر رہا تھا کہ اصبر علی ما یقولون۔ آپؐ کی کیفیت، جیسا آپؐ نے بیان کیا ہے، یہ تھی کہ گویا آپؐ لوگوں کی کمریں پکڑ پکڑ کے انھیں آگ میں گرنے سے بچا رہے ہوں۔ آپؐ ذرہ برابر اجر کے بھی طالب نہ تھے، مال و اقتدار ہو یا احسان مندی، شکر اور تعریف۔ لوگوں نے مال کی تقسیم کے بارہ میں آپؐ پر الزامات لگائے، فتح مکہ و حنین کے بعد تالیف قلب کے لیے

داد و دہش پر مخلصین کو بھی شکوہ ہوا، محبوب بیوی کے خلاف بہتان میں اچھے اچھے لوگ شریک ہو گئے، لیکن آپؐ کے درد و سوز اور محبت میں کمی نہ آئی، اور آپؐ عفو و درگزر ہی کی روش پر گامزن رہے۔

۲۔ یہ عفو و درگزر بھی رحمت اور نرمی کا نتیجہ تھا۔ اگر اصلاح کرنے والا یہ سمجھے کہ ساری نصیحت، وعظ و تذکیر اور وعدے وعید کے بعد لوگ غلطی نہیں کریں گے، کمزوری نہیں دکھائیں گے، گناہوں میں نہیں مبتلا ہوں گے، تو وہ فطرت انسانی سے بالکل ناواقف ہے۔ لوگوں سے گناہ سرزد ہوتے تھے... انفرادی بھی اور اجتماعی بھی... آپ حتی الامکان تادیب و تعزیر سے بچتے، ضمیر کو جگاتے، استغفار اور توبہ کی راہ دکھاتے اور قبولیت کی بشارت دیتے۔ اس طرح اصلاح کا عمل زیادہ وسیع اور راسخ ہوتا جاتا۔ اس روش کے بے شمار نمونے سیرت نبویؐ میں موجود ہیں۔

۳۔ تعلیم کا طریقہ بھی انتہائی شفیقانہ تھا۔ ایک صاحب نے نماز باجماعت کے درمیان کسی کے چھینکنے پر یرحمک اللہ کہا۔ جب لوگوں نے گھورنا شروع کیا، تو اس پر احتجاج کیا۔ نماز ختم ہوئی تو حضورؐ ان کی طرف متوجہ ہوئے اور بتایا کہ نماز میں باتیں نہیں کی جاتیں۔ وہ کہتے ہیں: "آپؐ پر میرے ماں باپ قربان، میں نے آپؐ سے زیادہ شفیق استاد نہیں دیکھا۔ نہ آپؐ نے مجھے ڈانٹا، نہ مارا، نہ بُرا بھلا کہا" (مسلم) اسی طرح، ایک بدو آیا اور مسجد نبوی کے صحن میں کھڑے ہو کر پیشاب کرنے لگا۔ صحابہ اس کی طرف (روکنے کے لیے) بڑھے۔ آپؐ نے ان کو منع کر دیا کہ اب حاجت پوری کرنے کے فطری عمل کے درمیان روکنے کی ایذا اس کو نہ پہنچے۔ فارغ ہو گیا، تو بلا کر پاس بٹھایا اور مسجد کے آداب کی تعلیم دی۔ پھر، اسے نہیں، صحابہ کو ہدایت کی، گندی جگہ کو پانی بہا کر صاف کر دیں۔ ساتھ ہی فرمایا: "تم خوشی اور بشارت دینے والے بنائے گئے ہو نہ کہ تنگی اور مشکل پیدا کرنے والے" (بخاری)

ہیں تو معمولی سے واقعے، لیکن آج ہر مسجد میں اور ہر جگہ غلطیوں کی اصلاح کی جو رَوِش عام ہے، کیا وہ بالعموم اس اسوۂ حسنہ کے بالکل برعکس نہیں۔ اسی طرح خود جماعت کے اندر اور ساتھ آنے والوں اور آسکنے والوں کے ساتھ ہماری روش بھی قابل توجہ ہے۔

رحمت اور نرمی کا دوسرا بنیادی پہلو یسر (آسانی اور سہولت) کی صورت میں کارفرما رہا۔ یسر کی صورتیں بے شمار ہیں۔ حجۃ اللہ البالغۃ حصہ اول میں شاہ ولی اللہ نے بعض اہم صورتوں کا احاطہ بڑی خوبی سے کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

۱۔ شرعی احکام ادنیٰ و اعلیٰ سب کے لیے ہیں۔ اس لیے حضورؐ نے کسی ایسی چیز کرنے کا مطالبہ سب لوگوں سے نہیں کیا جس کو کرنا ان کے لیے شاق اور مشکل ہوتا۔ مثلاً فرمایا: "اگر میں نہ سمجھتا کہ یہ میری

امت کے لیے مشکل ہو گا، تو میں حکم دیتا کہ ہر نماز کے وقت مسواک کریں"۔ ہم اگر اصلاح و تربیت کے جوش میں اپنی مجوزہ تدابیر اور مستحبات کو، استعداد کا لحاظ کیے بغیر، ہر کس و ناکس پر لازم کرتے رہیں، اور ان پر دینی مطالبات کا بوجھ بڑھاتے رہیں، تو نتیجہ یہی نکلے گا کہ مشکل سے ۱۰ فی صد لوگ پابندی کرنے والے نکلیں گے۔

۲۔ آپؐ نے نیکیوں کا حکم بھی دیا، ان کے ارکان، شرائط اور آداب بھی مقرر فرمائے، لیکن ان کی تفصیلات کو منضبط نہیں کیا۔ یہ اصلاح و تربیت کی حکمت تھی کہ آپؐ نے ان کی تفصیلات اور تکمیل کو لوگوں کی عقلوں پر چھوڑ دیا، کہ وہ الفاظ سے اور اپنی عادات کے مطابق خود سمجھ لیں۔ جب اس قسم کی کوئی بات آپؐ سے دریافت کی گئی، تو اسی قدر بتایا جو وہ سمجھ سکتے تھے، اور کوئی ایسی بات نہیں بتلائی جو ان کی عادات و معروفات میں نہیں تھی۔ مثلاً آپؐ نے نماز کے لیے استقبال قبلہ کو شرط قرار دیا، لیکن کوئی ایسا قاعدہ نہیں بتایا جس سے قبلہ کی سمت معلوم ہو سکے۔ اسی طرح آپؐ نے نماز کے اوقات اور قبلہ دریافت کرنے میں علم ہیئت اور ہندسہ کے مسائل جاننے کی تکلیف نہیں دی۔ فرمایا: "قبلہ مشرق اور مغرب کے درمیان ہے، بس کعبہ کی طرف رخ ہو"۔ تفصیلات بیان کرنے میں حرج عظیم ہے، کیونکہ ہر پابندی میں دقت ہوتی ہے، پابندیاں زیادہ ہو جائیں تو دقتیں اور تنگیاں بھی انتہا کو پہنچ جائیں گی۔ ان تفصیلات کو یاد رکھنے میں بھی بڑی دقت پڑے گی (جیسا آج کل ہو گیا ہے)۔ اس لیے اس سے بہتر کوئی مصلحت نہ تھی کہ جو چیز لازم کی جائے، اس کے اصول منضبط کر کے تفصیلات لوگوں پر چھوڑ دی جائیں۔

۳۔ ان احکام اور رسوم کا مطالبہ کیا جائے جن کی طرف لوگوں کو طبعاً رغبت ہو، جن کو کرنے سے وہ خوش ہوں، اور جو وہ از خود اپنے نفس کے داعیہ سے انجام دیں، باہر سے ٹھیلنے کی ضرورت نہ ہو۔ تاکہ جس چیز کا طالب دین ہو، طبیعت بھی اس کی خواہاں ہو۔ مثلاً عیدین اور جمعہ کے اجتماعات، مساجد کو پاک اور مزین رکھنا، جمعہ کے دن غسل کرنا اور خوشبو لگانا مسنون کر دیا، [عیدین کو کھانے پینے اور سیر و تفریح کا دن قرار دیا، اور اس دن دَف بجانے کی اجازت دی]، اور قرآن اور اذان میں خوش الحانی کو مستحب قرار دیا۔

۴۔ حضورؐ نے ان چیزوں کو مکروہ قرار دیا جو لوگوں کو بوجھ معلوم ہوں۔ مثلاً، غلام، بدو اور مجہول النسب کی امامت کو مکروہ قرار دیا۔ یہاں تک کہ آپؐ نے ایسے مستحبات کو بھی ترک کر دیا جن سے لوگوں کے دلوں میں اختلاف اور تشویش پیدا ہو۔ مثلاً آپؐ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ اگر تمھاری قوم زمانہ کفر سے قریب نہ ہوتی تو میں کعبہ کو بنیادِ ابراہیمی پر تعمیر کر دیتا۔ اسی طرح آپؐ نے ان چیزوں کو باقی رکھا جن کو لوگوں کی طبیعتیں چاہتی ہوں۔ مثلاً صاحبِ خانہ کو امامت کا مستحق قرار دیا۔

انھی اصولوں کے پیش نظر سید مودودیؒ نے عادات رسولؐ کو سنت واجبہ قرار دینے اور اجتہادی امور کو منصوص کا درجہ دینے کے بارہ میں یہ اصول پیش کیا: "میں یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ اس قسم کی چیزوں کو سنت قرار دینا، اور پھر ان کے اتباع پر اصرار کرنا، ایک سخت قسم کی بدعت اور ایک خطرناک تحریفِ دین ہے، جس سے نہایت بُرے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں اور آیندہ بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے" (رسائل و مسائل، ج ۱، ص ۲۴۷)۔ آپ خود اپنی ذات کی حد تک ضرور اس حد تک اتباع رسولؐ کریں کہ پلیٹ میں لوکی کے ٹکڑے تلاش کریں یا اپنے گلے کے بٹن کھلے رکھیں۔ لیکن دوسروں کی اصلاح میں ہر حکم کو اپنے مقام پر ہی رکھیں، بلکہ جہاں تک ممکن ہو، انھیں چھوٹ دیں اور سہولت دیں۔

رحمت، نرمی اور یسر کا ایک پہلو، جسے اپنی جگہ ایک اہم اصول کے طور پر سامنے رکھنا ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ حضورؐ نے اصلاح میں لوگوں کی عقل و فہم اور عمل کی استعداد اور مناسبت کو پوری طرح ملحوظ رکھا، اسی کے پیش نظر تدریج اور ترتیب کا راستہ اختیار کیا، اور جہاں ضروری سمجھا وہاں لوگوں کو رخصتیں دیں، افراد کی حد تک بھی اور اجتماعی طور پر بھی۔ اس رحمت و حکمت کے بھی بے شمار نمونے ہیں جو سیرت رسولؐ میں پھیلے ہوئے ہیں۔

حضرت عمرو بن عبسہؓ مکہ کے ابتدائی دنوں میں حاضر ہو کر مسلمان ہوئے، اور عرض کیا کہ میں بھی آپؐ کا ساتھ دینے کو تیار ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: آج کل ہم لوگ جن مظالم کا ہدف بنے ہوئے ہیں، ان کا برداشت کرنا تمھاری طاقت سے باہر ہے۔ فی الحال تم اپنے وطن واپس چلے جاؤ، اور جب سنو کہ مجھے غلبہ نصیب ہوا تو میرے پاس آنا (طالب الہاشمی، وفود عرب بارگاہ نبوی میں، ص ۲)۔ حضرت بریدہؓ نے قبیلہ بنی اسلم کے ۸۰ گھرانوں کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ آپؐ نے انھیں اپنی جگہ رہنے کی ہدایت فرمائی، اور تحریری پروانہ دیا کہ "وہ مہاجر ہی ہیں، جہاں بھی رہیں" (ایضاً، ص ۲۳۸)۔ اسی طرح ۵ھ میں بنی مزینہ کے ۴۰۰ گھڑسوار مدینہ آئے، تو آپؐ نے ان کو ہدایت کی کہ اپنے علاقہ میں واپس جاؤ، جہاں بھی رہو گے تمھیں مہاجر سمجھا جائے گا۔ (ایضاً ص ۶۰)

ایک صاحب نے عرض کیا کہ بہت کوشش کرتا ہوں، فجر کی نماز وقت پر ادا نہیں کر پاتا۔ فرمایا کہ جب آنکھ کھلے پڑھ لیا کرو۔ قیامِ لیل کی فرضیت منسوخ ہوئی، تو عشا اور فجر کی نماز باجماعت کو آدھی آدھی رات کے قیامِ لیل کے برابر قرار دیا۔ صلٰوۃ لیل، عشا سے سحر تک کسی وقت پڑھنے کی سہولت بھی دی، اور نیند کے غلبہ کی وجہ سے چھوٹ جائے، تو ظہر تک پڑھنے کی صورت میں بھی ثواب کی بشارت دی۔

ایک حبشی عورت سے آپؐ نے پوچھا: اللہ تعالیٰ کہاں ہے؟ اس نے آسمان کی طرف اشارا کیا۔ اس کی عقل کی استعداد کے لحاظ سے یہ عقیدہ بھی قبول ہوا۔ فرمایا: "یہ عورت مومنہ ہے"۔ لوگ آتے، اور اسلام و ایمان کی حقیقت دریافت کرتے۔ آپؐ ارکان پنج گانہ بیان کرتے، اور بس کرتے۔ ایک بدو یہی سوال جواب کر کے واپس گیا، اور کہتا جا رہا تھا کہ "میں کوئی کمی بیشی نہیں کروں گا"۔ رسول اللہؐ نے فرمایا: "اگر یہ سچا ہے تو اس نے فلاح پالی" (بخاری، مسلم)۔ لیکن ظاہر ہے کہ اوروں دوسروں سے مطالبات صرف اتنے ہی نہ تھے۔

حکمتِ نبویؐ کا ایک عمدہ نمونہ، قبیلہ ثقیف کے اسلام کے واقعہ میں ہے۔ یہ تقریباً قریش کا ہم پلہ اور بڑا نامور اور جنگجو قبیلہ تھا، جس کے ہاتھوں حضورؐ پر طائف میں سخت ترین دن گزرا، اور جس نے اتنی شدید مزاحمت کی کہ آپؐ محاصرہ اٹھا کر واپس تشریف لے آئے۔ جس دن ان کا وفد قبولِ اسلام کے لیے مدینہ پہنچا تو آپؐ بے حد مسرور تھے، اور ان کو مسجد نبوی میں خیمے لگا کر ٹھہرایا۔ اب اسلام لانے کے لیے "بات چیت" شروع ہوئی۔ انھوں نے زنا کی اجازت مانگی، سود کی اجازت مانگی، شراب پینے کی اجازت مانگی، پھر نماز معاف کرنے کی درخواست کی۔ آپؐ نے ہر مطالبہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، لیکن ان کے اتنے لغو مطالبات پر نہ ڈانٹ ڈپٹ کی، نہ سلسلہ گفتگو منقطع کیا۔ یہ درخواستیں نامنظور ہو گئیں، تو وفد نے زکوٰۃ اور جہاد سے استثنا کی درخواست کی۔ یہ آپؐ نے منظور فرمالی۔ بعد میں فرمایا: "جب یہ لوگ صدق دل سے اسلام قبول کریں گے، تو جہاد بھی کریں گے اور زکوٰۃ بھی دیں گے۔" اس کے بعد وفد نے پوچھا کہ ہمارے بت، لات، کے بارہ میں آپؐ کا کیا ارادہ ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: "اسے توڑ دیا جائے گا"۔ یہ اتنے خوف زدہ تھے کہ بولے: "اس بت کو توڑنا تو بربادی کو دعوت دینا ہے"۔ حضرت عمرؓ سے ضبط نہ ہوا اور کہا: "تم ایک بے جان پتھر سے اتنا ڈرتے ہو"۔ اہلِ وفد نے برہم ہو کر کہا: "عمر تم نہ بولو، ہم تمھارے پاس نہیں آئے ہیں"۔ پھر انھوں نے حضورؐ سے عرض کیا: "لات کو گرانے کا کام ہم سے تو نہیں ہو سکے گا، آپ خود جو چاہیں کریں"۔ حضورؐ نے مسکراتے ہوئے فرمایا: "اچھا، تو یہ بت شکنی ہمارے ذمہ رہی، تم لوگ یہ کام نہ کرنا"۔

اس کے بعد وفد مسلمان ہو گیا۔ حجۃ الوداع کا موقع آیا تو کوئی ثقفی ایسا نہ تھا جس نے اسلام قبول نہ کر لیا ہو۔ حضورؐ کا یہ یقین بھی درست ثابت ہوا کہ جب دلوں میں ایمان راسخ ہو جائے گا، تو خود بخود زکوٰۃ بھی دیں گے، اور جہاد کے لیے بھی نکلیں گے (ایضاً ص ۱۸۴ تا ۱۹۱)

جب سید مودودی سے شادی بیاہ کی غیر شرعی رسومات کے بارہ میں مطالبہ کیا گیا کہ جماعت "ان کی وضاحت اس طرح کر کے بتلائے کہ "اباحت" کا پرچہ چاک ہو جائے --- (ورنہ ان رسوم کو) قابل

بغاوت قوانین باطل سے مستثنیٰ قرار دینے کی وجوہ تحریر کریں"، تو انھوں نے اسی اصولِ تدریج کے مطابق جواب دیا کہ "علاج یہ نہیں کہ براہ راست ان رسموں کے خلاف کچھ کہا جائے، بلکہ صرف یہ ہے کہ لوگوں کو قرآن و سنت کی دعوت دی جائے... ہم اَلْاَقْدَم فَالْاَقْدَم کے اصول پر کام کر رہے ہیں۔ پہلے دین کی جڑوں کو دلوں میں جمانا ضروری ہے۔ اس کے بعد تفصیلات... کو درست کرنے کا موقعہ آئے گا۔ اگر ہم شادی بیاہ، لین دین اور دوسرے معاملات کی تفصیلات و جزئیات بیان کرنے پر اتر آئیں تو ہماری اصولی دعوت کا کام منتشر ہو جائے گا (رسائل و مسائل، ج ۱، ص ۱۳۸، ۱۴۰)

شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں: جن امور میں مشقت تھی، عمل یا طبیعت کے لحاظ سے۔ انھیں حضور نے آہستہ آہستہ نافذ کیا۔ اسی کے متعلق حضرت عائشہؓ کا قول ہے کہ اول وہ سورتیں نازل ہوئیں جن میں صرف جنت دوزخ کا ذکر تھا، بعد میں حرام حلال کے احکام نازل ہوئے۔ اگر یہ احکام شروع ہی میں نازل ہوتے، تو لوگ کہہ دیتے کہ ہم شراب نہیں چھوڑیں گے، ہم زنا نہیں چھوڑیں گے (حجۃ اللہ البالغہ، ج ۱)

جنت کا یہ مقام صرف حکمتِ اصلاح کی وجہ سے نہیں، بلکہ دراصل یہی مقصودِ زندگی ہے، اسی کو مقصود بنانا چاہیے، اسی مقصود کی طرف بلانا چاہیے۔ ضماد بن ثعلبہؓ مکہ کے ابتدائی دنوں میں مسلمان ہوئے، اور پوچھا: "اگر میں سب باتیں مان لوں تو مجھے کیا ملے گا؟"۔ فرمایا: "جنت"۔ انصار نے بیعتِ عقبہ کے موقع پر جان و مال قربان کر دینے کی بیعت کی، اور پوچھا: "اگر ہم اپنے اس عہد کو پورا کر دکھائیں تو اس کے صلہ میں کیا ملے گا؟"۔ فرمایا "جنت"۔ غزوۂ احد میں جب آپؐ راہِ خدا میں سر کٹانے کے لیے پکار رہے تھے، تو زبان پر یہی الفاظ تھے: "تیزی سے لپکو (اور ایک دوسرے سے آگے بڑھو) اس جنت کی طرف جس کی وسعت میں زمین و آسمان سما جائیں"۔ اب ہم خود ہی یہ دیکھ سکتے ہیں کہ ہماری گفتگوؤں، دعوت، تقاریر اور سرگرمیوں میں اس جنت کا حصہ کتنا ہے، جس کو لوگ حضورؐ کی صحبت میں بیٹھتے تھے تو ایسا محسوس کرتے تھے کہ آنکھوں کے سامنے ہے۔

جنت کی طمع کی کنجی سے دلوں کے قفل کھل جاتے ہیں، پھر انسانوں کے دل خود مفتی اور نیکی و بدی کی میزان بن جاتے ہیں، نیکی سے انھیں اطمینان نصیب ہوتا ہے اور بدی سے کھٹک پیدا ہوتی ہے۔ اور اعمال، عادات، رسومات اور نظام کی اصلاح کا راستہ کھل جاتا ہے۔

اصلاح و انقلاب کا ایسا تصور کہ، فرد ہو یا اجتماعیت، جو کچھ ہے وہ سب توڑ پھوڑ دیا جائے گا، اور ہر چیز نئے سرے سے تعمیر ہوگی، نہ عملاً ممکن ہے، نہ حقیقت سے مطابقت رکھتا ہے، نہ یہ انبیا کرامؑ کے نقشہ کار کے مطابق ہے۔

انبیا کے، اور خصوصاً نبی کریمؐ کے نقشہ اصلاح کی وضاحت کرتے ہوئے شاہ ولی اللہؒ لکھتے ہیں:
"اگر تم شریعت رسول اللہؐ چاہو تو پہلے ان امیین کے حالات کو دیکھو جن میں آپؐ کی بعثت ہوئی۔ انھی کے حالات آپؐ کی شریعت کا مادہ ہیں۔ پھر یہ دریافت کرو کہ تشریع و تیسیر کے مقاصد کے مطابق ان کی اصلاح کی کیفیت کیا تھی۔

حضورؐ نے زمانہ جاہلیت کے لوگوں کے حالات پر نظر ڈالی، ان کے عقاید، عبادات، معاملات، اخلاق اور تمدن کو دیکھا۔ ان میں جو حصہ ملّتِ ابراہیمی کے مطابق تھا یا شعائرِ الٰہی پر مشتمل تھا، اور صحیح تھا، اس کو آپؐ نے باقی رکھا، اور اس پر عمل کرنے کی تاکید فرمائی۔ جہاں تحریفات ہوگئی تھیں، یا فساد و بگاڑ پیدا ہوگیا تھا، یا شرک اور کفر کی جو علامتیں تھیں، آپؐ نے ان کی اصلاح کی یا ان کو مٹا دیا، اور ان کا بطلان مستحکم کر دیا۔ آپؐ نے عبادات کے اسباب، اوقات، شرائط، ارکان، آداب، اور مفسدات کی تعلیم دے کر انھیں منضبط کر دیا۔

اگر کوئی فہیم ہو، احکام کی اطراف و جوانب پر اس کی نظر ہو، تو وہ یہ بات دیکھ سکتا ہے کہ آپ نے، اور دیگر انبیاؑ نے، عبادات میں کوئی ایسا نیا طریقہ مقرر نہیں کیا جو پہلے سے لوگوں میں پایا نہ جاتا ہو، یا جو پایا جاتا تھا اس کے مثل نہ ہو۔ حضرت ابوذرؓ حضورؐ کے پاس آنے سے پیش تر تین سال سے نماز پڑھا کرتے تھے۔ وہ صبح صادق سے غروب آفتاب تک روزہ رکھا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے زمانہ جاہلیت میں ایک شب کے اعتکاف کی نذر مانی تھی اور اس سلسلہ میں رسول اللہؐ سے استفسار کیا تھا۔

عقاید اور عبادات کے طریقوں کی اصلاح کے ساتھ ساتھ، تمدن کے نظام، قوانین اور رسوم کی اصلاح کرنا بھی انبیا کی بعثت کا مقصد ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ رائج الوقت تمدن اور اس کے طریقوں اور قوانین و رسوم پر نظر ڈالتے۔ جو طور طریقے صحیح ہوتے ان کو باقی رکھتے اور ان کا حکم دیتے، اور جو فاسد ہوتے ان سے منع کرتے۔ وہ جو رائج امور صحیح ہوتے ہیں، ان میں کسی چیز کو ختم کرنا اور اس کی جگہ کوئی دوسری چیز لانا بے معنی ہے۔ بلکہ وہ لوگوں کو ان کی پابندی پر اور زیادہ آمادہ کرتے۔ ان کی رائے اور طریقوں کو درست قرار دیتے، اور ان امور کی مصلحتیں بیان کرتے۔ لیکن اگر ان کی وجہ سے ایک شخص کو دوسرے سے اذیت پہنچ سکتی ہو، دنیوی لذتوں میں انہماک بہت زیادہ بڑھتا ہو، احسان کی روش سے اعراض پیدا ہوتا ہو، یا دنیا اور آخرت کے مصالح سے غفلت و لاپروائی ہوتی ہو، تو یہ ضروری ہوتا ہے کہ ان میں تبدیلی کی جائے۔ یہ تبدیلیاں ایسی ہوتی ہیں جو ان لوگوں کے مالوفات کے بالکل مخالف نہ ہوں، یا جو ان چیزوں کے مثل ہوں جو ان کے ہاں یا دیگر صالحین کے ہاں عام طور پر رائج ہوں۔ ان کی عقلیں بھی ان تبدیلیوں کو رد نہ کریں، بلکہ وہ اس پر مطمئن ہو سکیں کہ یہ صحیح اور برحق ہیں۔ وہ لوگ جن

کا علم راسخ ہے خوب جانتے ہیں کہ شریعت نے نکاح، طلاق، معاملات، لباس، حدود، میراث میں ایسی چیزیں مقرر نہیں کیں جن سے لوگ ناواقف ہوں، یا ان کا پابند بنانے سے وہ تردد میں پڑ جائیں۔ شریعت نے تو رائج رسوم و قوانین کی کجی کو درست کر دیا اور ناقص و کمزور چیزوں کو صحیح کر دیا۔ تمدنی طور طریقوں میں اچھے اور برے دونوں پہلو ہوتے ہیں۔ ان کو برقرار رکھا گیا، اِلّا یہ کہ ان میں کوئی چیز غلط ہوئی، مگر ان کے اندر اذکار و آداب مقرر کیے۔

آج دنیا کا غالب تمدن، جاہلیت جدیدہ کا تمدن ہے۔ لیکن اس کی اصلاح کا حکیمانہ نقشہ کار ہر نقش کہن کو مٹانے کے بجائے انبیا کرام اور نبی کریمؐ کے طریقہ کی بنیاد ہی پر بنانا چاہیے۔

حکمتِ نبوی، حضورؐ کے خلقِ عظیم اور آپؐ کے نقشۂ اصلاح کی مجتہدانہ فہم کے ساتھ اگر ہم اپنے معاشرہ کی اصلاح کا فریضہ انجام دینے کے لیے آگے بڑھیں گے، تو کوئی وجہ نہیں کہ توفیقِ الٰہی ہمارے ہمرکاب نہ ہو۔

جنوری ۹۴ میں ہم نے ترجمان القرآن کے صفحات ۵۶ سے بڑھا کر ۸۸، اور کاغذ سفید کر دیا تھا، مگر قیمت ۱۰ روپیہ اور سالانہ زر تعاون --/ ۱۰۰ روپے رکھا تھا۔ یہ قیمت اس وقت بھی کم تھی۔ لیکن دوران سال میں تین اقساط میں کاغذ کی قیمت تقریباً ۴۰ فی صد بڑھ گئی ہے، اور ڈاک خرچ میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ ابھی آیندہ سال ہر چیز میں روز افزوں گرانی کا سامنا ہے۔ ہماری کوشش رہی کہ خسارہ کو اشتہارات اور خیرخواہوں کے تعاون سے پورا کریں۔ لیکن اب یہ ناگزیر ہو گیا ہے کہ قیمت میں اضافہ کیا جائے۔ چنانچہ بادلِ ناخواستہ ہمیں جنوری ۹۵ سے قیمت ۱۲ روپے اور سالانہ زر تعاون ۱۲۰ روپے کرنا پڑ رہا ہے۔ امید ہے قارئین ہمارے ساتھ تعاون کریں گے۔

جو حضرات ۱۵ دسمبر تک خریدار بنیں گے، یا جو خریدار ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ تک اپنا بدل اشتراک نقد بھیج دیا کریں گے (بجائے وی پی کے) ان سے ہم ۱۱۰ روپے کا رعایتی بدل اشتراک لیں گے۔

خطرے کی سرخ جھنڈی

ضعفِ ارادہ یہ ہے کہ ...... آدمی اپنی کمزوری پر جھوٹ اور مکر کے پردے ڈالنے کی کوشش کرے اور بڑھتے بڑھتے یہ ثابت کرنے کی کوشش پر اتر آئے کہ خرابی اس میں نہیں ہے بلکہ جماعت میں ہے۔ یہ محض ایک کمزوری نہیں ہے بلکہ ایک بداخلاقی ہے، جسے کسی ایسی جماعت میں پھلنے پھولنے نہ دینا چاہیے، جو اخلاقی بنیادوں ہی پر دنیا کی اصلاح کرنا چاہتی ہو۔

ایک کوتاہ عمل اور سست کار آدمی اپنی اس حالت کے لیے جماعت کے افراد کی کمزوریوں اور جماعت کے کام اور نظام کی خامیوں کو ذمہ دار ٹھہرائے اور انھیں اپنی بددلی کا سبب قرار دے۔ یہ درحقیقت خطرے کی سرخ جھنڈی ہے، جو اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ اب یہ فتنہ پردازی کی طرف مائل ہو رہا ہے۔ اس موقع پر اس سے بددلی کے اسباب کی تفصیل پوچھنا غلط ہے۔ یہ سوال اس سے کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اسے اس فتنہ کے راستے پر چلا دیا جائے، جس کے سرے پر ابھی وہ پہنچا ہے۔ یہاں اسے عیب چینی کا اذنِ عام دینے کے بجائے اس کے دوستوں کو اسے خدا سے ڈرانا چاہیے اور اس کو شرم دلانا چاہیے کہ خود ایک ناقص کارنامہ اور خام کردار لے کر وہ کس منہ سے دوسرے پر تنقید کی جرأت کر رہا ہے.... جب کہ بددل کرنے والی خرابیوں کو پیدا کرنے میں تیرا اپنا حصہ دوسروں سے بڑھ کر ہی ہے اور کام خراب کرنے میں تیرا اپنا عمل دوسروں کے لیے نظیر بن رہا ہے۔

(ایک بندۂ خدا)

(اشتہار)

۶۰ سال پہلے

آپ پوچھتے ہیں کہ "تفصیلاتِ نماز وغیرہ جو "غیر از قرآن" ہیں کیوں فریضۂ اوّلین قرار دی جائیں۔" اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہؐ کی بتائی ہوئی تفصیلات نماز وغیرہ کو غیر از قرآن کہنا ہی سرے سے غلط ہے۔ اگر کوئی ماہرِ فن طبیب، فنِ طب کے کسی قاعدہ کو عملی تجربہ کر کے شاگردوں کو سمجھائے، تو آپ اسے خارج از فن نہیں کہہ سکتے۔ ہر علم و فن کی اصولی کتابوں میں صرف اصول اور مہمات مسائل بیان کر دیے جاتے ہیں، اور عملی تفصیلات استاد کے لیے چھوڑ دی جاتی ہیں، کیونکہ استاد عملی مظاہرے سے جس بات کو چند لمحوں میں بتا سکتا ہے، اسی کو اگر الفاظ میں بیان کیا جائے تو صفحے کے صفحے سیاہ ہو جائیں اور پھر بھی شاگردوں کے لیے لفظی بیان کے مطابق ٹھیک ٹھیک عمل کرنا مشکل ہو جائے۔ کتاب کے حسنِ کلام اور اس کے کمالِ ایجاز کا غارت ہو جانا مزید برآں۔

یہ حکیمانہ قاعدہ جس کو معمولی انسان تک اپنے علوم و فنون کی تعلیم میں ملحوظ رکھتے ہیں، آپ کی خواہش ہے کہ وہ سب سے بڑا حکیم جس نے قرآن نازل کیا ہے، اس کو نظر انداز کر دیتا۔ آپ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں نماز کے اوقات کا نقشہ بناتا، رکعتوں کی تفصیل دیتا، بلکہ نماز کی رائج الوقت کتابوں کی طرح ہر ہیئت کی تصویر بھی مقابل کے صفحات پر بنا دیتا، پھر تکبیرِ تحریمہ سے لے کر سلام تک نماز میں جو کچھ پڑھا جاتا ہے وہ بھی لکھتا، اور اس کے بعد وہ مختلف جزئی مسائل تحریر کرتا، جن کے معلوم کرنے کی ہر نمازی کو ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح قرآن کے کم از کم دو تین پارے صرف نماز کے لیے مخصوص ہو جاتے۔ پھر اسی طور پر دو دو تین تین پارے روزہ، حج اور زکوٰۃ کے تفصیلی مسائل پر بھی مشتمل ہوتے۔ اس کے ساتھ شریعت کے دوسرے معاملات بھی۔۔۔ جزئیات کی پوری تفصیل کے ساتھ درجِ کتاب کیے جاتے۔ اگر ایسا ہوتا تو بلاشبہ آپ کی یہ خواہش تو پوری ہو جاتی کہ شریعت کا کوئی مسئلہ "غیر از قرآن" نہ ہو۔ لیکن اس سے قرآن مجید کم از کم انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے برابر ضخیم ہو جاتا، اور وہ تمام فوائد باطل ہو جاتے جو اس کتاب کو محض ایک مختصری اصولی کتاب رکھنے سے حاصل ہوئے ہیں۔

(ترجمان القرآن، رسائل و مسائل؛ جلد ۵، عدد ۲، شعبان ۱۳۵۴، ص ۷۰، ۷۱)

توسیع و استحکام

رائے عام

ہماری تعمیری کوششیں بے سود ہو جائیں گی اگر ساتھ ساتھ ان کی پشت پر ایک مضبوط رائے عام بھی تیار نہ ہوتی رہے۔ اربوں انسانوں کو ہمارے پیغام سے واقف ہونا چاہیے، کروڑوں انسانوں کو کم از کم اس حد تک اس سے متاثر ہو جانا چاہیے کہ اس چیز کو حق مان لیں جس کے لیے ہم اٹھ رہے ہیں، لاکھوں انسانوں کو ہماری پشت پر اخلاقی اور عملی تائید کے لیے آمادہ ہونا چاہیے، اور ایک کثیر تعداد ایسے سرفروشوں کی تیار ہونی چاہیے جو بلند ترین اخلاق کے حامل ہوں اور اس مقصد کے لیے کوئی خطرہ، کوئی نقصان، کوئی مصیبت برداشت کرنے میں تامل نہ کریں۔ (روداد، اول، ص ۶۶-۶۷)

توسیع سے گھبرانے کی ضرورت نہیں، ہونے دیجیے۔

کوئی تحریک بھی جب شروع ہوتی ہے، تو وہ مخلص ترین لوگوں کے ذریعے شروع ہوتی ہے۔۔۔۔ اس طرح کے لوگ جب کسی تحریک کو لے کر چلتے ہیں، اس وقت فی الواقع یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک جاندار، مستحکم اور مضبوط قیادت فراہم ہوئی ہے۔ لیکن جب۔۔۔۔ اس کی طرف لوگوں کا رجوع بڑھتا ہے اور اس کے حامیوں کی تعداد بڑھتی ہے، تو اس مرحلہ پر ایک مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔

اس مسئلہ کو آپ یوں سمجھیں کہ تحریکوں میں ایک چیز ہوتی ہے Extension (توسیع) اور دوسری Consolidation (استحکام)، اگر ان دونوں چیزوں کے درمیان توازن باقی نہ رہے تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ توسیع زیادہ تیز رفتار سے ہوتی جاتی ہے، جبکہ اسے مستحکم بنانے کے کام میں کمی آتی جاتی ہے۔ اس معاملے میں اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ یہ ایک فطری بات ہے۔ جتنا آپ کا کام بڑھے گا، آپ کی استحکامی قوت کی بہ نسبت توسیع کا کام زیادہ ہوگا۔

مثال کے طور پر آپ دیکھیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ابتدائی تیرہ سال میں

چند سو آدمی آپؐ کے ساتھ آئے۔ اس کے بعد چار پانچ سال کی مدت میں زیادہ سے زیادہ چند ہزار آدمی دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ لیکن جس وقت مکہ فتح ہوا اور حنین میں کفر و شرک کی زبردست قوت کو شکست دے دی گئی تو، جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے۔۔۔ لوگ فوج در فوج آکر اللہ کے دین میں داخل ہوتے گئے۔۔۔ایک بڑی کثیر تعداد ان میں ایسی تھی جو دین کو پوری طرح سمجھ کر نہیں آئی تھی اور نہ دینی اخلاق کو اپنے اندر جذب کر سکی تھی۔ دین کی روح ان کے اندر اچھی طرح پیدا نہیں ہو سکی تھی۔ اس کا نتیجہ تھا کہ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد یک لخت ارتداد کا دور شروع ہو گیا۔

اب دیکھیے کہ وہ کیا چیز تھی جس نے اس ارتداد کے طوفان کو پھیر دیا اور عرب کو پھر اسلام پر مضبوطی کے ساتھ جما دیا۔ وہ یہ تھی کہ رسولؐ جو nucleus (مرکز) چھوڑ گئے تھے، وہ اتنا زبردست تھا کہ اس نے اتنے بڑے ارتداد کو کچل کر رکھ دیا تھا۔

اس سے آپ سمجھتے ہیں کہ اگر توسیع (extension) زیادہ بڑے پیمانے پر ہو جائے تو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ استحکام (consolidation) اگر پوری طرح نہ ہو سکے تو اس سے بھی گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اصل چیز یہ ہے کہ تحریک کا نیوکلیس اتنا مضبوط ہو کہ وہ اپنے گرد ایک بڑا ہالہ جمع کر لے اور یہ ہالہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہے۔ اور اگر وہ اس سے ہٹے تو وہ نیوکلیس دوسری طاقتوں کو کھینچ کر اپنے ساتھ ملا لے۔۔۔

توسیع کتنی بھی ہوتی چلی جائے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ توسیع کو روکنے کی بھی ضرورت نہیں۔ توسیع ہونے دیجیے، لیکن نیوکلیس مضبوط بناتے چلے جایے۔ یہ چیز ان شاء اللہ آپ کو اس پریشانی سے نکال دے گی کہ رفتارِ کار سست ہوتی جا رہی ہے یا کمزوریاں پیدا ہو رہی ہیں۔ (تصریحات، ص ۳۳۵، ۳۳۷)

توسیع اور استحکام کے درمیان توازن

توسیع اور استحکام کے درمیان توازن و تناسب ذہنی دنیا میں تو قائم کیا جا سکتا ہے، مگر عملی دنیا میں یہ ممکن نہیں ہے۔ ایک شخص اگر آپ کے پاس شرک یا کفر سے توبہ کرنے کے لیے آئے، تو آخر کس عذر کی بنا پر آپ اسے الٹا واپس کر دیں گے؟ کیا آپ اس سے یہ کہیں گے کہ اس وقت میں استحکام میں مصروف ہوں، اور توسیع کا کام میں نے فی الحال بند کر رکھا ہے؟

(ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۵۳ء، بحوالہ رسائل و مسائل، چہارم، ص ۲۹۰)

ایک کشتی کے سوار

سید قطب شہیدؒ / یوسف القاسمی

"اللہ رب العزت کے احکام کی اتباع کرنے والے اور خلاف ورزی کرنے والے، دونوں کی مثال ایک کشتی کے ان سواروں کی سی ہے جن میں کچھ لوگ نچلے حصہ اور کچھ لوگ بالائی حصہ میں سوار ہوں، اور نیچے کے لوگ اپنی ضرورت کا پانی بالائی حصہ سے جاکر لاتے ہوں۔ اس لیے انھوں نے یہ طے کیا کہ ہم خواہ مخواہ اوپر جاکر لوگوں کو تکلیف دیتے ہیں، کیوں نہ نیچے کے حصہ میں ایک سوراخ کرلیں۔ اب اگر اوپر کے لوگوں نے ان کے اس عمل میں مداخلت نہ کی اور ان کو سوراخ کر لینے دیا، تو نیچے اوپر کے سب ہی لوگ ہلاک ہو جائیں گے۔ اس کے برخلاف اگر انھوں نے ان کو سوراخ نہ کرنے دیا اور انھیں اس غیر دانشمندانہ اقدام سے باز رکھا، تو سب کے سب محفوظ و مامون رہیں گے۔"

اس حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑھنے سے ایک حیرت انگیز تمثیل اور زندہ حقیقت آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ کشتی کی تشبیہ کتنی انوکھی اور حقیقتِ واقعہ سے کتنی مشابہ ہے۔ حیات انسانی اور معاشرہ انسانی کی اس سے بہتر تمثیل ناممکن ہے۔ انسانی زندگی کی مثال بالکل اس کشتی کی طرح ہے، جو موجوں میں گھری سمندر کے سینہ پر رواں دواں ہے۔ سمندر کی زبردست موجیں اس کے وجود کو ہر لمحہ ایک نئے خطرے سے دوچار کرتی ہیں، اور یہ ایک منٹ بھی پُرسکون نہیں ہو پاتی۔ اس کی سلامتی اور حفاظت مشکل ہے۔ کشتی کا ہر سوار موت کے ڈر سے اپنی نیند کھو بیٹھتا ہے۔ ہر شخص پر کڑی نظر رکھی جاتی ہے اور ہمہ وقت چوکنا اور ہوشیار رہا جاتا ہے کہ کسی فردِ واحد کی غلطی سب کو نہ لے ڈوبے۔

ہماری اس دنیا میں انسانی معاشرے کی مثال اس کشتی کے عین مطابق ہے جس پر نیک و بد، عالم و

جاہل، غافل و ہوشیار سب طرح کے لوگ سوار ہیں، اور یہ ان کو لے کر رواں دواں ہے۔ لیکن معاشرے کی یہ کشتی چہار جانب سے اٹھنے والی مسموم اور تیز و تند ہواؤں کی زد میں ہے۔ ماحول کی ہر حرکت اس پر اثر انداز ہوتی ہے۔ کبھی اعمالِ صالحہ کا نور اس کی عظمت کا نشان بنتا ہے اور کبھی مفسدات کا ریلا انسانی معاشرہ کو پستی و انحطاط کے گڑھوں میں پھینک دیتا ہے۔

اکثر لوگ سفینۂ حیات کی اس زندہ حقیقت کو بھلا چکے ہیں، وہ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ان کا سفینۂ زندگی سمندر میں نہیں بلکہ خشکی پر مضبوطی سے پیر جمائے کھڑا ہے، جس کو سمندری طوفان اور موجوں سے ہلاکت کا کوئی اندیشہ بھی نہیں۔ غیر شعوری طور سے یہی ان کو بغاوت اور سرکشی پر ابھارتا ہے۔

سرکش اور باغی اگر یہ سوچتا کہ یہ انسانی سماج کوئی جامد اور مضبوط پہاڑ نہیں، بلکہ ایک کشتی کے مانند ہے، جس کو ایک مقام پر ٹھہرنا نصیب نہیں، اور نہ اس کی طاقت و اقتدار کو دوام مل سکتا ہے۔ یہ تو چند روزہ سفر ہے، اور اس کو یقینی طور سے ایک روز ختم ہو جانا ہے۔ اگر وہ اس زندہ حقیقت اور روزانہ مشاہدے میں آنے والی اس سچائی کو تسلیم کر لیتا، اور اس کے پس منظر پر غور کرتا، تو تکبر و خود سری اور شر و فساد کی کبھی جرات نہ کرتا۔ کیوں کہ اگر وہ اپنی وقتی اور محدود طاقت کے مدمقابل ایک لافانی اور لامحدود طاقت کو دیکھتا، تو یقیناً اس سے خوف کھاتا اور اس کی طرف رجوع کرتا۔ اگر یہ باغی شخص سمجھ لیتا کہ وہ ایسی کشتی کا سوار ہے جو ہمہ دم موجوں کے رحم و کرم پر ہے، جن کا ہر تھپیڑا کشتی کو موت و زیست سے دوچار کر سکتا ہے، تو یہ خود کو کبھی خواہشات کے گرداب میں نہ پھنساتا، بلکہ احتیاط کے ساتھ پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا تاکہ کسی طرح وہ اپنی زندگی کو ہلاکت و بربادی سے بچا لے۔ اس طرح دوسرے مسافر بھی طمانیت کے ساتھ ساحلِ نجات سے ہمکنار ہوتے۔

غفلت و لاپروائی سے قلب زنگ آلود ہو جاتے ہیں، اور پھر معصیات کی سیاہی اعمالِ صالحہ کی رمق کو آہستہ آہستہ ختم کر دیتی ہے۔ نبی اکرمؐ نے لوگوں کو اس مہلک بیماری سے بہت ڈرایا ہے، لیکن اس حدیث مبارک میں حیات انسانی کے لیے کشتی کی مثال ایک حیرت انگیز اور دل کو جھنجھوڑنے والی تعبیر ہے۔

رسول اکرمؐ نے زندگی کی اس اچھوتی اور بے مثال تشریح کے ذریعے اسلام کے نظریہ مساوات کو پیش کیا ہے، کہ تمام انسان بلا فرقِ مراتب ایک کشتی کے سوار ہیں، اگر کسی کو کسی پر ترجیح ہے تو صرف اعمالِ صالحہ کی بدولت۔ کُلکُم مِن اٰدم وَاٰدم من تراب۔

اس کے مدمقابل موجودہ دور کے ان نظریات کو دیکھیے جہاں خود کو افضل و اعلیٰ تسلیم کیا گیا ہے۔ قوم پرست، طبقہ کا خیال ہے کہ وہ زمین کے سب سے اعلیٰ و ارفع انسان ہیں، اور سرمایہ داروں کا خیال

ہے کہ وہ کارخانوں اور فیکٹریوں کے مالک ہیں اور دوسرے ان کے غلام ہیں۔ اسی طرح دنیا کے ہر طبقۂ فکر کے لوگ خود کو دوسروں سے بہتر گردانتے نظر آتے ہیں۔ ان مختلف فرقوں اور نظریات کے حامل لوگوں ہی نے اس شکستہ کشتی حیات میں سفر کیا، نتیجتاً سب لوگ برباد اور ہلاک ہو گئے، چاہے وہ اوپر کی منزل کے صالح لوگ ہوں یا نچلی منزل کے بدکردار۔

اس پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے ان مقامات کی تاریخ کو دیکھنا چاہیے جہاں بربریت کا دور دورہ رہا، اور جنگ وجدال کے بھیانک عفریت نے ظالموں کے ساتھ ہزاروں بے گناہوں کو بھی نگل لیا۔ یقیناً یہ نتیجہ ہے کہ نیچے کے لوگوں نے اپنی مرضی کے مطابق اس سفینہ میں سوراخ کر لیا، اور اوپر کے لوگوں نے ان کو اس ناعاقبت اندیشانہ عمل سے روکنے اور باز رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ لہٰذا پانی کے اس سوراخ نے آہستہ آہستہ پوری کشتی کو غرقاب کر دیا، اور یوں سارا معاشرہ تباہ ہو گیا۔

ایک خبطی نوجوان نفس پرستی اور شہوت برآری میں دن رات مگن ہے، اور کہتا ہے کہ میرے نجی معاملہ میں کسی کو مداخلت کا کوئی حق نہیں، مجھے جو پسند ہے اور میرا دل جو چاہتا ہے کرتا ہوں۔ اگر لوگوں نے اس کو اس کی مرضی کے مطابق چھوٹ دے دی، تو یقینی طور سے پورے معاشرے کا امن و سکون برباد ہو جائے گا۔ اب یہ لڑکا سوچنے لگے کہ میرا وجود تو محض سمندر کے ایک قطرے کی طرح ہے، ایک قطرہ چاہے وہ زہری کا ہو، سمندر پر اس کا کیا اثر ہو گا، یہ تو ایسا ہی ہے جیسا کہ فضائے بسیط میں ایک بوسہ یا خلوت میں چند منٹ کی لطف اندوزی، کیا یہ سارے معاشرے کو بگاڑ سکتا ہے؟ یہ لڑکا جاہل اور نادان ہے، اور جو لوگ اس کو بداعمالیوں سے نہیں روکتے، وہ اس سے بھی زیادہ جاہل اور نادان ہیں۔

اس نوجوان کا اپنے آپ کو، معاشرے سے بے تعلق فردِ واحد یا محض سمندر کا ایک قطرہ سمجھنا، بہت بڑی غلطی ہے۔ کیوں کہ اگر ہر شخص اسی طرح سمجھنے لگا، تو پورا معاشرہ گدلا ہو جائے گا۔

اب ایک دوسرے نوجوان کو لیجیے۔ فرض کیجیے، وہ یہ کہے کہ واقعی معاشرے کی حالت بہت ابتر ہے، ہر طرف بدکاری کا تعفن ہے۔ لیکن اب تنہا بھلا میں کیا کر سکتا ہوں، پورے معاشرے کی اصلاح میرے بس کی بات کہاں، پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے۔ اب تنہا میں دنیا سے کنارہ کشی اختیار کروں اور ساری دنیا لطف اندوز ہوتی رہے، تو بھی اس سے کیا فائدہ؟

اس نوجوان کی بات حقیقت سے قریب ہے۔ کیوں کہ جب پورا معاشرہ مفسدات کی گرفت میں آ جائے، اور بدکاری کی ہوائیں عام ہوں، تو تنہا کسی فرد کا برائیوں سے بچنا معاشرے کی اصلاح نہیں کرتا، بلکہ اللہ کی سنت یہ ہے کہ پورا معاشرہ تباہ و برباد ہو جاتا ہے، اور کشتی ڈوب جاتی ہے۔

اسی طرح کوئی وہ نوجوان لڑکی ہے جو نیم عریاں حالت میں گزرے تو اس کے یہ انداز نوجوانوں

میں جنسی آگ لگا دیں گے۔ وہ کہتی ہے کہ میں خود مختار ہوں، کسی کو میرے معاملے میں مداخلت کی ضرورت نہیں، میرا کیا میرے ساتھ ہے۔ کیا میں جذبات کا گلا گھونٹ دوں؟ یا راہبہ بن جاؤں؟ میرا دل چاہتا ہے کہ زندگی کا صحیح لطف اٹھاؤں جو میرا پیدائشی حق ہے۔ اگر میں گھر میں بیٹھی رہوں، تو زندگی کو رنگین کس طرح بنایا جائے گا۔ میں کسی حالت میں بھی اپنے اس طرزِ زندگی سے نہیں ہٹ سکتی۔"

اس لڑکی کے بیان میں قدرے سچائی بھی ہے، لیکن یہ سچائی اس وقت نہ تھی جب اس نے فتنہ پرور انداز سے نکلنے کی کوشش کی تھی۔ گویا کہ اس روز اس نے کشتی میں یہ سوچ کر سوراخ کر دیا تھا کہ "اس سے معاشرے یا کشتی کا کیا نقصان ہے۔" یہاں تک کہ اب معاشرہ مکمل طور سے اس بدکاری کی لپیٹ میں آگیا، اور بربادی کے دہانے پر کھڑا ہو گیا۔

اسی طرح ایک صحافی یا ادیب ہے جو فحش اور عریاں ادب پھیلا رہا ہو، اپنے قلم سے ایک صاف ستھرے معاشرے کے خدوخال کو داغ دار کرنے میں لگا ہو، یہ کہے کہ میرا دل جو چاہتا ہے لکھتا ہوں، میں کسی کی ذات پر حملہ نہیں کرتا، اس لیے کسی کو میرے معاملہ میں مداخلت کی گنجایش نہیں ہے۔ اب اگر لوگ ابتدا ہی میں اس کے فاسد ادب اور فحش تحریروں پر احتجاج نہیں کرتے، تو بلاشبہ وہ خدا کی زمین پر فتنہ و فساد پھیلا کر رہے گا۔ پھر یہ قلم کار اپنی تخلیقات سے دولت اور شہرت حاصل کر سکتا ہے، اور ہو سکتا ہے اس کو دیکھ کر دوسرے ادیب بھی اس کی پیروی کرنے لگیں، اور نہایت فخر سے یہ اعلان کرتے پھریں کہ ہماری جدت پسندی نے دونوں جنسوں کو دقیانوسی خیالات سے آزادی دے کر نئی دنیا مہیا کی ہے، جہاں مکمل آزادی سے زندگی گزارنا اور لطف اٹھانا ہمارا فطری حق ہے۔

پھر ایک عرصہ بعد کوئی صحافی یا ادیب اپنے کو اس دنیا سے الگ تھلگ رکھنے کی کوشش کرے، اور یہ کہے کہ میں تنہا اس طوفان کا کس طرح مقابلہ کروں۔ یہاں کی فضا کے ہر ذرے میں حیاتِ نو کا نشہ ہے، ہاتھ میں جام و سبو ہے۔ اس ماحول میں قدامت پرستی کی پرانی دھنوں کو کون سنے گا؟ ظاہری بناؤ سنگھار کے مقابلے میں باطنی نظافت کس کو اچھی لگے گی؟ چلتی پھرتی حوروں کے سامنے، سنی سنائی حوروں کی کس کو خواہش ہو گی۔ اور پھر سب سے بڑی بات ان جدید لوگوں میں صالح ادب کو پسند کرنے والے خریدار کہاں سے ملیں گے، اس لیے کہ عام مذاق عریاں رسالے اور فحش افسانے کا بن گیا ہے۔

یقیناً اس ادیب و صحافی کی بات بڑی حد تک درست ہے۔ لیکن جب پہلے ادیب نے فحش نگاری کا آغاز کیا تھا تو لوگ یہ سوچ کر خاموش تماشائی بن گئے تھے کہ وہ دوسروں کے اعمال کے مکلف نہیں ہیں۔ اگر انھوں نے اسی وقت مداخلت کی ہوتی، تو اتنی فاسد فضا قائم نہ ہوتی۔ آج سفینۂ معاشرت پانی کے دباؤ سے بوجھل ہو چکا ہے۔ تہ کے سوراخوں نے اس کی سلامتی کو غیر یقینی بنا دیا ہے۔

یہ چند مثالیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارک سے ماخوذ ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ انسانی معاشرے کے چند بدکردار نفوس اپنی غلط روی سے پورے معاشرے کو گندہ کر دیتے ہیں، اگر ابتدا میں ہی پورا معاشرہ ان کا بائیکاٹ کر دے، تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ شیطانی چالوں سے توبہ نہ کریں۔ لیکن اگر ان کو تھوڑا سا عرصہ بھی آزادی کے ساتھ بدکرداری اور خواہشات نفس پورا کرنے کے لیے مل گیا، اور سفینہ معاشرت کی حالت دگرگوں ہونا شروع ہو گئی، تو اس کا سنبھلنا بہت مشکل ہے۔ اور یہ ڈوبا تو ظالم و مظلوم اور صالح و بد تفریق کے بغیر سب کا انجام ہلاکت ہے، کوئی بچ نہیں سکتا۔ کیوں کہ سب کے مصالح اور مقاصدِ سفر ایک ہیں۔ یہاں کسی کا کوئی انفرادی مقصد نہیں۔ ہر ایک کی مصلحت کسی نہ کسی طرح دوسرے سے وابستہ ہے، اور ایک کا نقصان دوسرے کا نقصان ہے۔ پورا معاشرہ ایک جسم ہے، جسم کے ہر حصہ کا اثر سارے بدن پر ناگزیر ہے، اس حقیقت کا انکار ممکن ہی نہیں۔

قرآن مجید نے کتنا صریح اعلان کر دیا ہے: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ (اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنی فکر کرو، کسی دوسرے کی گمراہی سے تمہارا کچھ نہیں بگڑتا اگر تم خود راہ راست پر ہو۔ المائدہ ۵-۱۰۵) حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کسی صحابیؓ کو تنبیہاً فرمایا: "اے لوگو تم اس آیت کریمہ کی تلاوت کر رہے ہو۔ میں نے نبی اکرمؐ سے سنا ہے۔ لوگ جب کسی ظالم کو ظلم کرتے دیکھیں اور اس کو نہ روکیں تو عنقریب اللہ رب العزت کا عذاب ان سب کو اپنی گرفت میں لے لے گا۔" (ابوداؤد، ترمذی)

معاشرے کے اتحاد کی مصلحت یہ ہے کہ آپس میں ایسا ربط ہو جس کی کڑیاں کسی بھی حالت میں ڈھیلی نہ ہوں، اور اس ربط میں کوئی چیز حد فاصل نہ بن سکے، بلکہ تمام انسان، ایک کشتی کے سوار کی مانند، ہر حالت میں ایک دوسرے کے شریک کار ہوں، ان میں باہمی امداد و تعاون کا جذبہ ہو جو معاشرے کی طرف سے اس کی ساری اکائیوں پر لازم ہے۔ یہ باہمی اتحاد و یگانگت امر بالمعروف، نہی عن المنکر، ایمان باللہ، تقویٰ اور صالح اغراض و مقاصد پر منحصر ہے۔ اس کے برخلاف معاصی اور حدود اللہ سے سرکشی کی بنیادوں پر کسی صالح اور باہم مربوط معاشرہ کا قیام ناممکن بلکہ ناقابلِ تصور ہے۔

اسلامی تحریکوں کی ناکامی کے اصل اسباب

صدر الدین اصلاحی

کوئی ۳۷ برس پہلے یہ مضمون ماہنامہ زندگی کے لیے لکھا گیا تھا۔ اس کی اصل حیثیت کسی نظری یا علمی بحث کی نہ تھی، بلکہ ایک تذکیر و تنبیہہ کی تھی، اور اسے تحریک اسلامی کی ایک اہم ضرورت کو سامنے رکھ کر لکھا گیا تھا۔ اپنے موضوع اور مدعا کے لحاظ سے یہ آج بھی نہایت اہم ہے۔ صاحب مضمون کی طرف سے ضروری اصلاح و ترمیم کے بعد اس کی تلخیص پیش کی جا رہی ہے۔ (مدیر)

ایک اصولی حقیقت

دنیا میں جب بھی کوئی تحریک فاتحانہ شان سے آگے بڑھی ہے تو صرف اس لیے بڑھی ہے، کہ وہ عوامل اس کے ہم رکاب تھے جو اس جیسی تحریکوں کی زندگی اور توانائی کے ضامن ہوا کرتے ہیں۔ اور اگر اس کے قدم کہیں رک گئے ہیں یا کسی منزل پر پہنچ چکنے کے بعد وہ پھر سے بے منزل ہو گئی ہے، تو ایسا اسی وقت ہوا ہے جب ان عوامل کی ہم رکابی سے اس نے اپنے آپ کو محروم کر لیا، اور ان کی بجائے کچھ دوسری نوعیت کے عوامل کے ہاتھوں میں اپنی باگ دے دی، ایسے عوامل کے ہاتھوں میں جو اسے صرف ناتوانی، انتشار اور سکوت مرگ ہی دے سکتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جب داعی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو دین حق کی اقامت کے لیے مبعوث اور مامور کیا گیا، تو آپ پر اور آپ کے ساتھیوں پر یہ حقیقت اچھی طرح کھول دی گئی تھی، اور پھر وقفہ وقفہ سے انھیں اس کی مسلسل یاددہانی بھی کرائی جاتی رہی، کہ فلاں فلاں باتوں کا تمھارے اندر پایا جانا اس فریضہ سے عہدہ برآ ہونے کے لیے قطعاً ناگزیر ہے، اور فلاں فلاں چیزیں ایسی ہیں جو تمھارے اندر اگر پیدا ہو گئیں تو تمھارا نامراد ہو جانا لازمی ہے۔

پھر اس اصولی تلقین ہی پر اکتفا نہیں کر لیا گیا، بلکہ ساتھ ہی ان کے سامنے پچھلی امتوں اور دعوتوں کی تاریخ عروج و زوال بھی کھول کر رکھ دی گئی، جو گویا واقعات کی زبان سے ان حقائق کی سچائی پر

شہادت دیتی جاتی تھی۔ خصوصاً پیش رَو اُمّت، یعنی بنی اسرائیل، کی بِپّتا داستان تو اتنی تفصیل سے بیان کی گئی، اور اتنی بار بیان کی گئی، کہ وہ تمام عوامل ایک ایک کر کے ابھر کر سامنے آ گئے جنھوں نے اس ملت کو ڈبویا تھا۔ اس طرح پچھلی امتوں کی یہ سرگزشتیں، جنھیں قرآن حکیم نے اتنے اہتمام سے اپنے سینے میں قیامت تک کے لیے محفوظ کر دیا ہے، امت مسلمہ کے لیے دراصل ایک نذیر مبین کی حیثیت رکھتی ہیں۔

قرآن حکیم کی یہ تنبیہہ یقینی طور پر ایک اصولی اور دائمی تنبیہہ تھی۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ امت یا اس کا کوئی گروہ جب کبھی اپنے نصب العین کی طرف پلٹے، تو اپنے سفر کے آغاز سے لے کر اپنی منزل مقصود پا لینے تک، اور پھر منزل پا لینے کے بعد بھی، اس تنبیہہ کو قرار واقعی عملی اہمیت دیے رہے اور ان عوامل پر برابر کڑی نظر رکھے جن کے ہاتھوں میں ملتوں اور دعوتوں کی پھانسی کے پھندے لٹک رہے ہوں۔ اب تو اس کے لیے ان عوامل کو ٹھیک ٹھیک پہچان لینا کہیں زیادہ سہل ہو گیا ہے، کیونکہ اس وقت اس کے سامنے صرف دوسری ہی ملتوں کے عروج و زوال کے واقعات اور اسباب نہیں ہیں، بلکہ خود اپنی آپ بیتی بھی موجود ہے۔

آج کے اہلِ دعوت کو ضرورت جو کچھ ہے، وہ صرف "پرہیز"، اور "احتیاط" کے زندہ عزم و احساس کی ہے۔ ورنہ "علاج" کا معاملہ ہو یا "حفظان صحت" کا، یہاں ہر ایک کے لیے مجرب تدبیروں کا پورا سامان موجود ہے۔ دعوت حق کی طویل تاریخ ہر قسم کے دعوتی تجربات اور ہر طرح کی دعوتی سرگزشتیں اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ ان "آیات بینات" کے ہوتے ہوئے بھی اگر آج کسی داعی گروہ پر یہ ضرورت واضح نہ ہو سکی اور اپنی دعوت کو متوقع خطرات سے بچائے رکھنے کی فکر نے اسے مضطرب نہ رکھا، تو یہ فی الواقع اس کے عقلی دیوالیہ پن کا ثبوت ہو گا۔ اور ایسی حالت میں اسے ہرگز اس بات کا حق نہ ہو گا کہ اپنی دعوتی مہم کو کامیاب دیکھ سکے۔

خود احتسابی کی ضرورت

یہ اصولی تنبیہہ ہماری تحریک اسلامی کے لیے بھی انتہائی اہمیت کی مالک ہے۔ اس تحریک نے امت کے مختلف گروہوں کے افکار و اعمال کا گہرا تنقیدی جائزہ لیا ہے، اور ان کے اندر جو بھی کوتاہیاں محسوس کی ہیں ان کو بغیر کسی لاگ لپیٹ کے صاف صاف منظر عام پر رکھ دینے میں کسی رعایت سے کام نہیں لیا، کیونکہ دعوتی اور دینی مصالح کے پیش نظر ایسا کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ مگر اسے اچھی طرح یاد رکھنا چاہیے کہ تنقید اور احتساب کا فریضہ بس اتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ وہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ چاہتا ہے، اور حق بات تو یہ ہے کہ یہی "بہت کچھ" ہی وہ چیز ہے جسے فی الواقع اصل تنقید اور حقیقی احتساب

سمجھنا چاہیے۔ اس سے مراد وہ تنقید ہے جو خود اپنے پر کی جائے، اور وہ احتساب ہے جس کی خوردبینوں کا رخ خود اپنے ہی افکار و اعمال کی طرف ہو۔ دوسروں کا جائزہ لینے کی واقعی ضرورت تو صرف کبھی کبھی پیش آسکتی ہے، مگر خود اپنے تنقیدی جائزے کی ضرورت ہر وقت رہتی ہے۔

اگر اس خود احتسابی کا اہتمام نہ رکھا گیا، اور اس تحریک کے علم بردار اپنے کو اس ضرورت سے خدانخواستہ ماورا سمجھ بیٹھے، اور کسی بے پروائی یا خام خیالی کے باعث ان عوامل ہلاکت کی طرف سے بے فکر ہو رہے، تو وہ دن دور نہ ہوگا جب وہ بھی عام امت کی تاریخ دہرا رہے ہوں گے، جس کا مدت سے حال یہ ہو چکا ہے کہ کتاب الٰہی کی تلاوت کرتے ہوئے اس کی زبان سے عیسائیوں یہودیوں اور دوسری گم راہ و معتوب قوموں پر تو برابر نفرین کرتی، اور ان کے افکار و اعمال پر لعنتیں بھیجتی رہتی ہے۔ لیکن ذرا نہیں دیکھتی کہ خود اس کا اپنا حال بھی کچھ مختلف نہیں رہ گیا ہے۔ ضرورت، اور شدید ضرورت ہے کہ آج جو لوگ وہ فرض ادا کرنے اٹھے ہوں جس کے لیے یہ امت وجود میں لائی گئی تھی، وہ اس خود رافضیحت دیگراں را نصیحت کی شرم ناک روش سے دور رہیں۔ ورنہ ہوگا یہ کہ ایک طرف تو وہ دوسروں کی غفلتوں اور کوتاہیوں کا شکوہ کرتے ہوں گے، دوسری طرف یہی عیوب خود ان کی قوت ایمان و عمل کو گھن کی طرح چاٹ رہے ہوں گے۔

خود احتسابی کی عمومی ذمہ داری

اس خود احتسابی کا حق اس وقت تک ادا نہیں ہو سکتا، جب تک کہ جماعت کا ہر فرد، خواہ اس کی پوزیشن جماعتی نظم اور ذاتی صلاحیت کے اعتبار سے کچھ ہی کیوں نہ ہو، اسے اپنے تحریکی فرائض میں فریضہ نمبر ایک نہ بنا لے۔ منصب اور علم و بصیرت کی بنا پر یہ ذمہ داری صرف وسیع ہو جاتی ہے، متعلقہ اشخاص کے لیے مخصوص نہیں ہو جاتی۔ اسی طرح کسی کے اندر اگر فہم و بصیرت کی صلاحیتیں معمولی ہوں، تو یہ بات اس کی ذمہ داری کو صرف محدود کر دیتی ہے ساقط نہیں کر دیتی۔ اس لیے کسی بھی فرد جماعت کا اپنے تئیں یہ گمان کر لینا کہ جماعت کو افکار و اعمال کی خرابیوں سے محفوظ رکھنے کی ذمہ داری تمام تر اہلِ مناصب اور "بڑے" لوگوں ہی کی ہے، اور ہم جیسے "معمولی" کارکن اس کے مکلف نہیں ہیں، ایک خطرناک غلط فکری ہے۔ اور اگر یہ غلط فکری عام ہو جائے تو کچھ بعید نہیں کہ تحریک کے لیے موت و حیات کا مسئلہ پیدا ہو جائے۔

اس فکر و اہتمام اور احتیاطی کوشش کی کامیاب عملی تدبیر صرف یہ ہے کہ ان وجوہ و اسباب کی ٹھیک ٹھیک تشخیص کر لی جائے جو دعوتوں کے بگاڑ اور زوال کے باعث بنتے آئے ہیں۔ پھر انکی صرف تشخیص

اور توضیح کر دینے ہی پر اکتفا نہ کر لیا جائے، جس طرح کہ ایک ریسرچ اسکالر کیا کرتا ہے، بلکہ ان تنبیہوں اور عبرتوں کا ایک مرقع اور اسبابِ زوالِ حق کا ایک آئینہ بنا کر خود اپنے روبرو رکھ لیا جائے۔ یہ آئینہ جب جب بھی کسی فکری یا عملی کجی کی نشان دہی کرے، تو اس کجی سے اپنے آپ کو پاک کر لینے میں نہ ایک لمحہ ضائع کیا جائے، اور نہ کسی تاویل یا مداہنت یا غفلت سے کام لیا جائے۔

لیکن یاد رہے کہ شیشے کے آئینوں میں اپنے ظاہری خط و خال کا دیکھ لینا جتنا آسان ہوتا ہے، الفاظ و معانی کے اس آئینے میں اپنے اندرون کا دیکھ لینا اتنا آسان نہیں ہوتا جب تک کہ دو باتوں کا شدت سے لحاظ نہ رکھا جائے۔

ایک تو یہ کہ نفس کی عیاریوں پر پوری نظر رکھی جائے۔ یہ شاطر نفس اپنے کو غلطیوں اور خطاؤں سے بری ظاہر کرنے میں بڑا حریص بھی واقع ہوا، اور بڑا ماہر بھی۔ اس کے پاس پُرفریب تاویلیں تیار کر لینے کی بڑی تیز رفتار مشینیں موجود ہیں۔ نقد و احتساب نے کسی غلطی کی نشان دہی کی نہیں، کہ وہ اس طرح کی تاویلوں کا ایک خوشنما پردہ اس پر ڈال دینے کے لیے لپک پڑتا ہے۔ اور کمزوریوں کا پتلا انسان مطمئن ہو جاتا ہے کہ نہیں، میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔ فلاں بات جو مجھ سے سرزد ہوئی ہے وہ کوئی غلطی یا برائی نہیں بلکہ ان ان پہلوؤں سے عین حق و صواب تھی۔ نفس کے اس کید سے ہوشیار رہنا، کامیاب خود احتسابی کے لیے پہلی ضروری شرط ہے۔

اور یہ کوتاہیاں بسا اوقات اپنے قالب بدل بھی لیتی ہیں۔ اس لیے ضروری نہیں کہ جن کوتاہیوں نے گزشتہ تحریکوں اور جماعتوں کے اندر ایک خاص شکل اور خاص رنگ میں ظہور کیا ہو، ٹھیک اسی شکل اور اسی رنگ میں اب بھی ظہور کریں۔ شیطان کی یہ ایک بڑی مشہور اور کارگر چال ہے کہ وہ اپنی ہدایات اور ترغیبات کو ہمیشہ اور ہر شخص کے سامنے ایک ہی انداز میں پیش نہیں کرتا، بلکہ جدت سے کام لیتا اور موقع و محل کو اور انسان کی فکر و نظر کے کمزور پہلوؤں کو پوری طرح ملحوظ رکھتا ہے، تاکہ ابن آدم آسانی سے مات کھا جائے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان جس چیز کے خلاف نفرت اور غصہ ظاہر کرتا ہوتا ہے، اسی چیز کو بسا اوقات ایک نئے جامے یا نئے قالب میں پا کر اپنے سینے سے لگا لیتا ہے۔ نفس اور شیطان کے اس کید سے خبردار رہنا دوسری ضروری شرط ہے۔

اسلامی تحریکوں کی ناکامی کے اصل اسباب

ہم یہاں صرف ان خاص قسم کے اسباب و عوامل کا ہی جائزہ پیش کرنے پر اکتفا کریں گے جن کی خطرناکی اس بات کا تقاضا کرتی ہے، کہ ان کی طرف سے ہر حال میں اور ہر اسلامی تحریک کو چوکنا رہنا

جا ہیے۔

۱- اخلاص اور للّٰہیت کی کمی

کسی اسلامی تحریک کے اسبابِ زوال میں سب سے نمایاں حیثیت اس مرض کو حاصل ہے جو اس کے کارکنوں کے اخلاص اور للّٰہیت کو لاحق ہو جاتا ہے۔ یہ مرض جتنا ہی زیادہ شدید اور عام ہوتا ہے تحریک اتنی ہی زیادہ زندگی سے دور اور موت سے قریب ہو رہتی ہے۔ دو باتیں ایسی ہیں۔ جن کی بنا پر اس کی حیثیت دوسرے تمام اسباب سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔

ایک تو یہ کہ یہ طبعاً ایک جان لیوا مرض ہے۔ اگر پوری شدت سے اس کا حملہ ہو جائے تو کسی تدبیر سے بھی اس کے مہلک اثرات کا ازالہ ممکن نہیں۔ جب کہ دوسرا کوئی بھی سببِ زوال ایسا سم قاتل نہیں ہوتا کیونکہ اس کے عمل و اثر کی رفتار کو مختلف تدبیروں سے ایک حد تک بہرحال مدھم کیا جا سکتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ ان دوسرے اسباب و عوامل میں سے بھی کچھ تو ایسے ہیں جن کا شجرۂ نسب بھی بالآخر اسی "عامل اکبر" سے جا ملتا ہے، اور جو دراصل اسی اُمّ الامراض کے انڈے بچے ہیں۔ اور باقی کا بھی حال یہ ہے کہ، اگرچہ ان کی پیدائش کچھ اور ہی ذہنی اور نفسیانی امراض کے بطن سے ہوتی ہے، مگر یہ اخلاص و للّٰہیت کی کمی ہے جو عموماً انھیں تیزی سے پروان چڑھنے کے لیے ایک سازگار فضا بخشتی اور پھر تحریک پر کاری ضرب لگا سکنے کے قابل بنا دیتی ہے۔

اخلاص کا مطلب یہ ہے کہ تحریک کے مقصد پر دل یکسر مطمئن، اور اس کی خاطر جدوجہد کے لیے ذہن بالکل یکسو ہو۔ دنیا کے کسی اور کام کو شریک نہ بنایا جائے۔ حتیٰ کہ اس کی بابت کچھ سوچا بھی نہ جائے۔ اپنی تمام دوڑ دھوپ اسی کے لیے خاص کر دی جائے۔ فکر پر وہی چھایا ہوا ہو اور عمل و حرکت کی باگیں تمام تر اسی کے ہاتھوں میں ہوں۔ دوسری کسی چیز سے اگر تعلق ہو تو صرف اسی حد تک جس حد تک کہ خود مقصد تحریک اس کا تقاضا کرتا ہو، یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ اس کی اجازت دیتا ہو۔

للّٰہیت کا مطلب یہ ہے کہ مقصد تحریک کے ساتھ یہ تعلق اور اس تعلق میں یہ اخلاص صرف اللہ کے لیے اور صرف اسی کی رضا کے لیے ہو۔ اسکی رضا کے سوا کسی اور کی رضا کا دل میں گزر ہو، نہ اس حقیقی غایت اور اس اعلیٰ مفاد کے سوا اور کوئی غایت اور مفاد نگاہوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکے۔ اپنی ذات اور اپنا خاندان، اپنی قوم اور اپنی ملت، اپنی پارٹی اور اپنی جماعت، اپنا ملک اور اپنا وطن، پوری انسانیت اور ساری دنیا، ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے۔ جس کی رضا یا جس کا مفاد، مقصد، تحریک سے وابستگی کا اصل محرک بن سکے۔

للہیت ہی وہ خاص جوہر ہے جو کسی تحریک کو "اسلامی تحریک" بناتا ہے اور اسے دوسری تمام تحریکات سے ممتاز کرتا ہے۔ ورنہ جہاں تک مطلق اخلاص کا تعلق ہے،وہ تو غیر اسلامی تحریکوں کے لیے بھی اسی طرح ضروری ہے جس طرح کہ اسلامی تحریکوں کے لیے۔ اقامت دین کا یہ کام،جو کسی بھی صحیح اسلامی تحریک کا واحد نصب العین ہوتا ہے،اگر خالصۃ لوجۃ اللہ نہ ہوگا،تو اس کا جو نام بھی چاہے رکھ دیجیے،مگر قرآنی دعوت یا اسلامی تحریک،اقامت دین یا شہادت حق کا نام اسے کسی حال میں نہ دیا جاسکے گا۔ دین کی اقامت کے لیے اخلاص اگر دھڑکتے ہوئے دل کا درجہ رکھتا ہے،تو للہیت اس دل کے لیے اس کے اندر گردش کرنے والے خون صالح کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایسے خون سے اگر دل کا جوف خالی ہو تو یقیناً وہ زندگی کا کوئی ثبوت مہیا نہ کرسکے گا۔

"اللہ کی رضا" اور "آخرت کی کامیابی" کے الفاظ سے کوئی غلط فہمی نہ ہو کہ اخلاص اور للہیت کے فقدان کے جو بھی نتائج ہوں گے وہ صرف اللہ کے پاس،اور آخرت ہی میں سامنے آئیں گے،اس دنیا میں ظاہر نہ ہوں گے۔ بلاشبہ افراد کی انفرادی حیثیتوں کی حد تک صورت واقعہ یہی ہے۔ مگر یہ افراد باہم مل کر جو جماعت بناتے ہیں،اسے تو ان نامبارک نتائج سے وقت کے وقت اسی دنیا میں دوچار ہو جانا پڑتا ہے۔ کیوں کہ یہ دنیا افراد کے لیے اگرچہ صرف دار العمل ہے،مگر جماعتوں اور تحریکوں کے لیے یہ دارالعمل بھی ہے اور دار الجزا بھی۔ اس لیے اگر کسی اسلامی تحریک کے افراد کے سینے اخلاص کے سوز اور للّہیت کے نور سے بڑی حد تک خالی ہو گئے ہوں تو اس کے معنی یہ ہوں گے۔ کہ وہ ضروری زادِ راہ کے بغیر ہی سفر کررہی ہے،اور نہیں کہا جاسکتا کہ اب کون سا بیابان اس کے لیے بیابان مرگ،بن جانے والا ہے۔

نقل ہو یا عقل، ہر ایک کا فیصلہ اسلامی تحریکوں کے انجام کے بارے میں یہی ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم بار بار یہ حقیقت یاد دلاتا ہے۔ کہ اللہ کے دین کی راہ میں کی جانے والی جدوجہد کی کامیابی کا انحصار تمام تر اللہ کی نصرت پر ہے: وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ۔ اب اگر کوئی نام نہاد اسلامی تحریک بحیثیت مجموعی بھی اللہ ہی کے لیے اور اسی کی رضا کی خاطر نہ چل رہی ہو تو پھر اسے کیا حق ہے کہ وہ اس کے سہارے کی آس رکھے؟ اور کیوں اللہ تعالیٰ کا قانون عدل اسے اپنی نصرت کا سزاوار ٹھہرائے؟

عقلی اور تجرباتی نقطہ نگاہ سے دیکھیے،تو صاف نظر آئے گا کہ اخلاص و للہیت سے عاری کسی "اسلامی تحریک" کو وہ اندرونی یک جہتی کبھی میسر نہیں آسکتی جو کسی بھی تحریک کی کامیابی کے لیے لازمی شرط ہے۔ اصل اور حقیقی مدعا نظروں سے اوجھل ہونے کے باعث اس کے مختلف کارکن،اور کارکنوں کے مختلف حلقے،اپنے الگ الگ مقاصد کو سامنے رکھ کر کام کے نقشے اور طریقے تجویز کریں گے،اور ہر

گروہ اپنی ہی پسند کی ہوئی منزل کی طرف پوری تحریک اور جماعت کو کھینچ لے جانا چاہے گا۔ نتیجہ میں فکری وحدت اور عملی ہم آہنگی ناپید ہونے لگے گی، اور تحریک کا سفینہ باہمی کش مکش کے تھپیڑوں کی تاب نہ لا کر بالآخر غرق ہو رہے گا۔

دوسرے عوامل فساد کے مقابلہ میں اس روحانی مرض کا معاملہ اپنے علاج کے پہلو سے بھی بڑا ہی اہم اور نازک ہے۔ کیونکہ یہ مرض بالعموم انسان کے لاشعور یا تحت الشعور میں جنم لیتا ہے، اور پھر اسی کمین گاہ میں رہ کر اخلاص و للّٰہیت کی پونجی کو گھن کی طرح چاٹتا رہتا ہے، اس لیے اس کا نگاہِ احتساب کی گرفت میں آ جانا، بہت دشوار ہوتا ہے۔ گہرائیوں تک اتر جانے والی نظریں بھی اکثر اسے دیکھ پانے سے قاصر رہ جاتی ہیں۔

پھر اگر خوش قسمتی سے کسی طرح اس مرض کی موجودگی کا احساس ہو بھی جائے، تو اس کا صحیح صحیح اعتراف کر لینا کچھ آسان نہیں رہتا۔ کیوں کہ ایک تو، اس کے لیے ایمانی حس کی بیداری اور اخلاقی جرات کی فراوانی درکار ہوتی ہے۔ دوسرے، نوع انسانی کا ازلی دشمن اپنی مسلسل جنگ کا سب سے اہم مورچہ مومن کے قلب کو اور اس قلب کے جذبہ اخلاص و للّٰہیت ہی کو سمجھتا ہے۔ اس لیے اس مورچہ کی جیتی ہوئی کوئی چوکی وہ آسانی سے خالی نہیں کرتا، بلکہ اس کے لیے آخر وقت تک گھٹنے ٹیک کر لڑتا رہتا ہے، اور اپنا کوئی داؤ استعمال کرنے سے بچا نہیں رکھتا۔ کبھی دینداری کے پندار کو مشتعل کرتا ہے، کبھی نفس کے جھوٹے وقار کو غیرت دلاتا ہے، کبھی خوشنما تاویلوں کی افیون پلاتا ہے۔ اور اس طرح جی توڑ کر کوشش کرتا ہے کہ انسان کے اندر کا یہ انگڑائیاں لینے والا احساسِ للّٰہیت پھر غفلت کی نیند سو جائے۔ لہٰذا یہ اللہ کی عطا کی ہوئی خاص توفیق ہی ہے جو انسان کو اپنے اندر کھوٹ کا ٹھیک ٹھیک اعتراف کر لینے میں کامیاب بنا سکتی ہے۔

اس مرض کے اعتراف کے بعد تیسرا مرحلہ اس کے علاج کا آتا ہے، جو بجائے خود ایک بڑا مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ اس کے لیے مضبوط ارادے، صحیح تدبیر، مناسب پرہیز اور ایک طویل سعی و جہد کی ضرورت ہوتی ہے، جہاں بسا اوقات ایک لمحہ کی غفلت منزل سے سیکڑوں کوس دور پھینک دیتی ہے۔ غرض اس راہ ھفتخوان کا ہر مرحلہ انتہائی دشوار گزار اور صبر آزما ہے۔ لیکن جسے اپنے مقصد حیات سے واقعی محبت ہو اور کسی حال میں بھی اس کی بربادی گوارا نہ ہو، اسے خوش دلی کے ساتھ ان سارے مرحلوں کو طے کرنا ہی ہو گا۔

۲- دینی علم و بصیرت کی خامی

دوسرا بڑا عامل، دین کے اصل سرچشموں سے راست رہنمائی حاصل کرتے رہنے کی عملی صلاحیت سے محرومی کا عامل ہے۔

اس سے بیک وقت دو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک صحیح اجتہاد فکر میں اضمحلال، اور دوسرے، دینی بے بصیرتی۔ یعنی اس کے نتیجے میں ایک طرف تو تحریک کے علم برداروں پر فکری جمود اور ذہنی افلاس کا فالج گرتا ہے، دوسری طرف فکری انارکی کا فتنہ پھیلنے لگتا ہے۔

یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ کسی تحریک میں زندگی کا نمو اور صحیح سمت پر حرکت و اقدام کی صلاحیت اسی وقت تک رہتی ہے، جب تک اسے فکری اجتہاد کی غذا ملتی رہے، اور اصل دینی سرچشموں سے اس کی راست آبیاری کا سلسلہ جاری رہے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اس کے کارفرما عناصر ان سرچشموں کا راست علم رکھتے ہوں اور ان سے رہنمائی حاصل کرنے کی ضروری صلاحیت کے حامل ہوں، اور پھر اس صلاحیت سے کام لینا بھی جانتے ہوں۔ اسی کے ساتھ تحریک کے عام افراد بھی دین سے فی الجملہ واقف اور اس کے مزاج شناس ہوں، خود اپنی حدود کو بھی ٹھیک پہچانتے ہوں۔ لیکن اگر یہ صورت حال باقی نہ رہ سکے اور لوگ اپنے فرائض اور اپنی حدود کا لحاظ نہ رکھیں، خواص کتاب و سنت کو عملاً اپنا اصل رہنما بنائے رکھنے کی صلاحیت سے بے بہرہ ہو جائیں، یا صلاحیت رکھنے کے باوجود اس سے کام لینے کی خود اعتمادی سے محروم ہو رہیں، اور دوسری طرف عوام برخود غلط ہو جائیں، اپنی معمولی اور بالواسطہ دینی معلومات کے بل پر بطور خود دین کے تقاضے متعین کرنے اور اپنے اپنے ذوق کے مطابق تحریک کی راہ عمل مقرر کرنے لگیں، حتیٰ کہ انھیں دیکھ کر افتوا بغیر علم فضلوا واضلوا (علم کے بغیر فتویٰ دیتے ہیں، خود بھی گمراہ ہوتے ہیں دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں) کی حالت پیدا ہو جائے، تو ظاہر ہے ایسے دن تحریک کے لیے بڑے ہی نامبارک ہوں گے۔ اس وقت اس کا حال اس کشتی کا سا ہو جائے گا جس کے ناخدا تو چپو پھینک کر الگ بیٹھ گئے ہوں، اور کشتی کے مسافر اپنے اپنے ہاتھوں کو چپو بنا کر، جدھر جی چاہتا ہو کشتی کو بہالے جانے کے شغل میں مصروف ہوں۔

۳- شخصیت پرستی

تیسرا عامل، جو اس دوسرے عامل سے بڑا قریبی رشتہ بھی رکھتا ہے، "مخصی عقیدتوں کا غلو" ہے، جسے عرف عام میں شخصیت پرستی کہا جاتا ہے۔ انسانی نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے، اور تاریخی شواہد اس مطالعے کی تصدیق کرتے ہیں، کہ اس مرض کا حملہ دینی تحریکوں پر بہت ہوا کرتا ہے، اور جب ہوتا ہے تو بڑا خوفناک بھی ہوتا ہے۔

شخصیت پرستی کا مطلب یہ ہے کہ تحریک کے ساتھ لوگوں کا تعلق کسی بڑی شخصیت کی عقیدت کے واسطے سے ہو اور یہ عقیدت اس تعلق پر غالب ہو، خواہ اس تعلق کی ابتدا ہی اسی انداز سے ہوئی ہو یا بعد میں وہ یہ نوعیت اختیار کر گیا ہو۔ ایسے لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ دیکھتے ہیں اسی شخصیت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور جس بات کو بھی صحیح مانتے ہیں اس کی سند کے بعد ہی صحیح مانتے ہیں۔ وہ اسے سخت بے ادبی سمجھتے ہیں کہ ایسے مقدس شخص کی کسی رائے، کسی فتوے اور کسی نظریے کو عقلی اور نقلی دلائل کی ترازو میں تولا جائے، اور تول لینے کے بعد ہی اسے قبول کیا جائے۔ کہنے کو تو وہ بھی کسی غیر نبی کی عصمت رائے کے قائل نہیں، مگر عملاً کسی بھی ایسے شخص کے بارے میں، جس کی عظمت ان کے دلوں پر چھائی ہوئی ہو، یہ سننا پسند نہیں کرتے کہ اس کی فلاں رائے ضعیف ہے، اس لیے لائق قبول نہیں۔

عقیدت مندی کا یہ غلو ایک طرف تو لوگوں سے قوت فیصلہ اور کھرے کھوٹے کی تمیز سلب کر لیتا ہے۔ دوسری طرف اس کے اپنے درمیان سے اٹھ جانے کے بعد انھیں حیران و ششدر بنا کر رکھ دیتا ہے۔ وہ نہیں جان پاتے کہ اب کدھر جائیں اور کیا کریں؟ اس وقت انھیں تحریک کے مستقبل کی اتنی فکر نہیں رہ جاتی جتنا کہ اس شخصیت سے محرومی کا غم لاحق ہوتا رہتا ہے۔

یہی بات حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے دوران جب ظہور میں آئی، تو اپنے آخری نتائج کے ساتھ ظہور میں آئی۔ یعنی شخصی عقیدت کے غلو کے اس فتنہ نے یہاں تک رنگ دکھایا کہ بے شمار لوگوں کو جدوجہد کے میدان سے نکال کر عزلت کے گوشوں میں بٹھا دیا۔

پس جب تک کسی تحریک کے کارکنوں کے ذہن میں یہ بات اچھی طرح بیٹھی ہوئی نہ ہو کہ ہمارا حقیقی قائد اور ہمارا رہنما کوئی شخص نہیں سوائے اس شخص کے جس کا نام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے --- ٹھیک اسی طرح جس طرح ان کے دلوں کے اندر جب تک یہ حقیقت سرایت کیے ہوئے نہ ہو کہ رضائے الٰہی کے سوا ہماری سعی و جہد کی کوئی غایت مقصود نہیں --- اس وقت تک اس تحریک کا حال خطرناک اور اس کا مستقبل خطرناک تر ہی رہے گا۔

۴۔ تصور دین کی بے اعتدالی

چوتھا اہم عامل "تصور دین کی بے اعتدالی" ہے۔

ہوتا یہ ہے کہ احیائے دین کی کوئی تحریک جس وقت شروع ہوتی ہے، وہ ایسا وقت ہوتا ہے جب دین کی امانت دار ملت اپنے فرض منصبی سے عملاً غافل ہو چکی ہوتی ہے یا کم از کم یہ کہ وہ اس کے سلسلہ میں کوئی قابل لحاظ جدوجہد نہیں کر رہی ہوتی۔ اس کے اس رویہ کے پیچھے عموماً دو اسباب کارفرما ہوا

کرتے ہیں: ایک تو یہ کہ ملت کا احساس فرض، زندگی کی تڑپ کھو چکا ہوتا ہے۔ دوسرا یہ کہ اس کا تصور دین بھی کسی نہ کسی حد تک ناقص اور غیر متوازن ہو چکا ہوتا ہے۔

اس حالت میں، اور ان اسباب کے پس منظر میں، جب کچھ لوگ اللہ کی توفیق پاکر میدان عمل میں نکل آتے ہیں، اور وہ دین حق کے اس پرچم کو اٹھا لیتے ہیں، جو نہ جانے کب سے کس مپرسی کی حالت میں پڑا ہوتا ہے، تو فطری طور پر ان کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ لوگ ہر طرف سے کھینچ کر اس کے نیچے آ جائیں۔ خصوصاً ان لوگوں کے بارے میں تو ان کی یہ خواہش شدید سے شدید تر ہوتی ہے۔ جو "مسلم" ہیں، اور جن کے نزدیک آج بھی اس لفظ مسلم کے معنی بدل کر، آخرت فراموش، خدا ناشناس اور خود پرست کے نہیں ہو گئے ہیں۔ اور جو ان آیتوں کو بھی، جن میں امت مسلمہ کا مقصد وجود صرف حق کی شہادت اور دین کی اقامت بتایا گیا ہے، قرآن کریم کی ویسی ہی آیات الٰہی یقین کرتے ہیں جیسا کہ نماز روزے وغیرہ کا حکم دینے والی آیتوں کو۔

اس فطری خواہش اور امید کے ساتھ وہ لوگوں کو بلانے کے لیے گلی گلی منادی کرتے پھرتے ہیں۔ ایک ایک دروازے کی کنڈیاں کھٹکھٹاتے ہیں۔ جھونپڑیوں سے لے کر محلوں تک اور عبادت خانوں سے لے کر سیاست گاہوں تک ہر جگہ پکار آتے ہیں۔ لیکن اس دوڑ دھوپ کا جو حاصل نکلتا ہے وہ بالعموم ان کی امیدوں اور خواہشوں سے بہت کم ہوتا ہے۔ وہ بڑے دکھ اور بڑی حسرت کے ساتھ دیکھتے ہیں کہ دلوں کے دروازے ان کی دعوت کے لیے کھل نہیں رہے ہیں، بلکہ الٹے پیشانیوں پر بل پڑنے لگے ہیں۔ یہ صورت حال دیکھ کر وہ حیرت کے ساتھ سوچنے لگتے ہیں، کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ لوگوں کے سامنے کوئی ایسی چیز تو نہیں پیش کی جا رہی ہے جس کی حقانیت اہمیت اور ضرورت سے ایک مسلمان کو اختلاف ہو سکے، پھر یہ ردو انکار کس بنا پر ہے؟ اس سوچ بچار کے سلسلے میں جب وہ لوگوں کے اس رویہ کا ذہنی اور نفسیاتی تجزیہ کرتے ہیں، تو اس کے وہی دو اسباب نظر آتے ہیں، جن کا ابھی تذکرہ کیا گیا۔ یعنی احساس فرض کی مردنی اور تصور دین کی خرابی و بے اعتدالی۔ اس لیے اپنے مقصود و مدعا کی خاطر وہ ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ ان اسباب فساد کو دور کرنے کی بھرپور کوشش کریں۔

اب پہلی خرابی یا بیماری کے ازالے کے لیے وہ جو کچھ افہام و تفہیم کرتے ہیں، اس سے کم از کم سن ضرور لیا جاتا ہے۔ کبھی تو سر ندامت جھکا کر اور اپنی تقصیروں کا اعتراف کرتے ہوئے، اور کبھی ایک سنجیدہ خاموشی کے ساتھ۔

لیکن دوسری خرابی کی اصلاح کا معاملہ اتنا پرسکون نہیں ثابت ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کے دینی تصورات کی کسی خامی اور بے اعتدالی کا ازالہ اس وقت تک قریب قریب ناممکن ہی ہوتا

ہے، جب تک کہ ان پر تنقید نہ کی جائے، اس لیے چاروناچار انھیں یہ ناگوار فرض بھی انجام دینا پڑتا ہے۔ لیکن افکار و نظریات پر تنقید خواہ کتنی ہی برحق اور محتاط کیوں نہ ہو، عموماً ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کی جاتی۔ پھر تنقید بھی وہ جو عام افکار و نظریات پر نہیں، بلکہ لوگوں کے محبوب و مالوف تصورات پر کی جائے۔ یہاں تو تنقید کا فقرہ ابھی پورا بھی نہیں ہو پاتا کہ لوگ بھڑک اٹھتے ہیں، اور ہر طرف تحریک کی مخالفت کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوتا ہے، اور ضد و عناد کی وہ گرم بازاری ہوتی ہے کہ اس کے مسلّمہ بنیادی اصول و مقاصد تک پر حملے شروع ہو جاتے ہیں۔ کبھی سامنے سے اور کبھی پیچھے سے، کبھی براہ راست اور کبھی بالواسطہ۔

قدرتی طور پر تحریک کے کارکن بھی اس صورت حال سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ چنانچہ ان کے اندر تقریباً ضروری اس کا ایک خاص ردعمل ہوتا ہے، جس کے نتیجہ میں ان ناقص تصورات دین کے خلاف ان کا رویہ اور زیادہ سخت ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ وہ صاف دیکھتے ہیں کہ اس صورت حال کے ذمہ دار بہت کچھ یہی تصورات ہیں۔ یہ دینی ذہن رکھنے والے مسلمانوں کو بھی تحریک کے پیش کیے ہوئے نصب العین کی طرف آنے نہیں دے رہے ہیں، اس لیے اب ان کا فیصلہ بجا طور پر یہ ہوتا ہے کہ ان تصورات پر بھرپور ضرب لگائی جائے۔

لیکن دوسری طرف یہی وہ نازک وقت ہوتا ہے جب اہل تحریک خود بھی تصور دین کی ایک جوابی بے اعتدالی کے خطرے کی زد میں آجاتے ہیں۔ کیوں کہ اس وقت اس بات کا نہایت قوی اندیشہ ہوتا ہے کہ ان کے اس ردعمل میں غیر معمولی شدت اور غلو پیدا ہو جائے، اور وہ ایک غلطی کے جواب میں لاشعوری طور پر ایک دوسری غلطی کا ارتکاب کر بیٹھیں۔ اس موقع پر صرف وہی لوگ اس غلو سے محفوظ رہ سکتے ہیں جن کو خدا نے اونچے درجہ کی دینی بصیرت، قابل اطمینان سلیم الطبعی، اور ٹھوس فکری سنجیدگی عطا فرمائی ہو، ورنہ تحریک کی مخالفتوں کا ریلا عام لوگوں کو انتہا پسندی کی طرف دھکیل دیتا اور اعتدال کی شاہراہ سے ہٹا کر ایک دوسرے عدم توازن کا شکار بنا دیتا ہے۔

مخالفت کرنے والے اگر کسی دینی مطالبے کو اتنا بلند مقام دینے پر مصر دکھائی دیتے ہیں جو دین میں اس کا فی الواقع ہے نہیں، تو وہ اسے اس کا واجبی مقام بھی دینے پر آمادہ نہیں رہ جاتے۔ اسی طرح اگر وہ کسی چیز کی صحیح دینی اہمیت تسلیم کرنے سے انکار کر رہے ہوں، تو یہ اسے اس کے واقعی مرتبے سے بھی بہت اوپر اٹھا دیتے ہیں۔

مثلاً عام طور سے دیکھا جاتا ہے کہ غیر معتدل ذہنیت کے لوگ، اللہ تعالیٰ کی مختلف صفات میں سے کسی ایک صفت کو، اور اس کے تقاضوں کو، اس طرح ابھار دیا کرتے ہیں، کہ بعض دوسری صفات کے

تقاضے ان کے ذہنوں میں بڑی حد تک دب کر رہ جاتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں ان کے دینی افکار و تصورات کا پورا ڈھانچہ لازماً غیر متوازن ہو رہتا ہے۔ ایسے لوگوں سے سابقہ پڑنے پر تحریک کے کارکنوں کا رد عمل یہ رخ اختیار کر سکتا ہے کہ وہ اسی صورت حال کو الٹ کر خود بھی اختیار کر لیں۔ یعنی دوسری صفات کے جو تقاضے دوسرے لوگوں کے ذہن میں دب کر رہ گئے ہوں، انھیں وہ اس شدت سے اپنے ذہنوں پر حاوی کر لیں کہ ان کے نیچے اب مذکورہ بالا پہلی صفت کے واقعی تقاضے دب کر رہ جائیں۔

یہ ایک اصولی مثال تھی۔ اس پر اسلامی تعلیمات کی ساری باتوں کو قیاس کر لیجیے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی کسی جوابی بے اعتدالی کے معنی بھی یہی ہوں گے کہ دین کی اصل اور مکمل حقیقت اب بھی بروئے کار نہ آ سکے گی، اور اس کی حقیقی صورت زیبا پر بدستور پردہ پڑا رہ جائے گا۔ حالانکہ دینی تصور کی ہر بے اعتدالی بہرحال بے اعتدالی ہی ہے، خواہ اسے کسی تحریک کے علم بردار گروہ نے اختیار کر رکھا ہو یا کسی جمود پرست حلقے نے، اس کے مفاسد سے کسی حال میں بھی نہیں بچا جا سکتا۔ بلکہ شاید پہلی شکل میں تو یہ مفاسد اور زیادہ خطرناک ثابت ہوں گے۔ اس لیے کسی غیر متوازن دینی تصور کے ساتھ جو جدوجہد کی جائے .... اس کو کسی اور معنی میں تو چاہے دینی جدوجہد کہہ لیجیے مگر احیائے اسلام اور اقامت دین، کی جدوجہد قرار دینا ہرگز صحیح نہ ہو گا۔ ایسی جدوجہد کا انجام، دین کی واقعی اقامت کے نقطہ نگاہ سے بہرحال ناپسندیدہ ہی نکلے گا۔ ایک طرف تو صحیح دینی فکر و مزاج رکھنے والے لوگوں کے لیے وہ اپنے دروازے از خود بند کر لے گی۔ دوسری طرف اس کا ہر قدم جو آگے کو اٹھے گا، اصل شاہراہ سے کترا کر اٹھے گا۔ اور پھر آخر کار وہ امت کی تاریخ میں افتراق کے ایک نئے باب کا اضافہ کر کے ختم ہو جائے گی۔

۵۔ گروہی تعصب

پانچواں اہم عامل گروہی تعصب، ہے۔

انسان کی یہ ایک عام کمزوری ہے کہ وہ جس پیمانہ سے اپنے آپ کو ناپتا ہے، اسی سے دوسروں کو بھی ناپنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ وہ اپنے ساتھ حسن ظن سے کام لینے میں تو بڑا فیاض ہوتا ہے، مگر دوسروں کے معاملہ میں حد درجہ تنگ نظر بن جاتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تاویلیں اور رعایتیں تو سب میرے لیے ہوں، اور سخت گیریاں، سب کی سب غیروں کے لیے۔

اس جانبداری اور بے انصافی سے وہ اپنے ذاتی معاملہ کے محدود دائرے ہی میں کام نہیں لیتا بلکہ خاندانی اور قومی، نسلی، وطنی اور گروہی اور جماعتی معاملات کے وسیع دائروں میں بھی وہ اسی مذموم ذہنیت کا مظاہرہ کرتا ہے اور بسا اوقات تو یہاں اس کا ذوق ستم اور زیادہ ترقی کر جاتا ہے...... اس کی

وجہ یہ ہوتی ہے کہ اپنی ذات کے معاملہ میں اگر وہ یہ روش اختیار کرتا ہے، تب تو ہر طرف سے اس کی مذمت اور لعنت ملامت ہی ہوتی ہے، حتیٰ کہ خود اس کا اپنا ضمیر بھی، بشرطیکہ وہ بالکل ہی مر نہ گیا ہو، اندر سے جھٹکے دے دیا کرتا ہے۔ لیکن اگر وہ حق و صداقت کا یہ خون، قوم اور ملت کے نام پر اور پارٹی اور جماعت کی خاطر کرتا ہے، تو اس کے خلاف ایک انگلی بھی نہیں اٹھتی۔ اس کے برعکس اسے داد و تحسین کے پھولوں سے لاد دیا جاتا ہے، زندہ باد کے نعرے اس کے کانوں میں رس گھولنے لگتے ہیں، اور اسے سر آنکھوں پر بٹھالیا جاتا ہے۔ رہا اس کا ضمیر، تو تحسین و آفریں کے ان پرجوش ہنگاموں اور مظاہروں میں اسے بھی جھوٹے اطمینان یا فریب خوردگی کا شکار بن ہی جانا پڑتا ہے۔

نفس انسانی کی یہ کمزوری بڑی ہی زبردست اور ساحرانہ قوت کی مالک ہوتی ہے۔ وہ گروہ بھی جس نے پاک اور سچے جذبہ سے کسی اسلامی تحریک کا علم اٹھایا ہو، اس کے حملوں سے یکسر محفوظ نہیں خیال کیا جاسکتا۔ اسلام کی پوری تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ اس گروہی تعصب نے امت کو بار بار جس طرح پھاڑا ہے، آپ آج بھی تاریخ کی زبان سے اس کی پوری داستان سن سکتے ہیں۔ کتنی ہی دینی تحریکیں تھیں جو، حق کی خدمت اور اقامت کے نام اور جذبہ کے ساتھ اٹھائی گئیں، مگر اسی جاہلی عصبیت کا کرشمہ تھا کہ آخر میں کہیں سے کہیں نکل گئیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ تحریکوں کی ابتدا میں ایمان کا محتسب ساتھ ہوتا ہے، اور قرآن کی ترازوئے عدل ہاتھ میں، مگر جب اس موذی مرض کا حملہ ہوتا ہے تو اپنا گروہ اور اپنی جماعت ہی سب کچھ بن جاتی ہے۔ اس کا مفاد، حق کا مفاد اور اس کا دفاع، حق کا دفاع قرار پا جاتا ہے۔ اس کا ہر نظریہ اور ہر رویہ اس بات کا مستحق سمجھ لیا جاتا ہے، کہ جب اس پر نظر ڈالی جائے تو انتہائی حسن ظن اور احترام سے ڈالی جائے۔ اور اس پر بھی اگر کہیں سے اس میں کوئی نقص، نگاہ کے سامنے آہی جائے تو آنکھوں پر جھٹ دونوں ہاتھ رکھ لیے جائیں۔ اس کے مقابلہ میں دوسروں کے ہر نظریہ اور ہر رویہ کو سوئے ظن ہی کا حقدار سمجھا جاتا ہے، اور اس کی خوبیوں کا اعتراف کرنے میں انتہائی بخل سے کام لیا جاتا ہے۔ گویا "اپنی" جماعت، انسانوں کی جماعت نہ ہوئی، جن سے صواب کے ساتھ خطا کا بھی امکان ہے، بلکہ فرشتوں کا کوئی مقدس گروہ ہے، جن کے قریب سے بھی کسی فکری یا عملی لغزش کا گزر نہیں ہو سکتا۔ ظاہر بات ہے، کہ حق پسندی اور ہدایت یافتگی کا یہ اجارہ دارانہ تصور بجائے خود ایک بڑی گمراہی ہے، یہ اس بات کی کھلی ہوئی علامت ہے کہ دل، ایمانی خلوص اور للہیت کی حلاوت سے محروم ہیں۔

اس گمراہی اور کج روی کا سب سے خطرناک پہلو یہ ہوتا ہے کہ وہ حمایت حق اور ثبات ایمانی کا بھیس اختیار کیے ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے اس میں بلا کی کشش بھی ہوتی ہے، انسان کو اس پر کسی

ندامت کے بجائے الٹا ایک طرح کا فخر ہوتا ہے۔ کیوں کہ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ نفس انسانی کے لیے وہ ضلالت بڑی مرغوب بن جاتی ہے، جس پر حقانیت کی نقاب پڑی ہو۔ جو بدنصیب اس "آفت ایمان" جاہلیت، کی مضبوط گرفت میں آجاتا ہے، وہ سورج سے بھی زیادہ روشن، حق کو، اگر اس کا تعلق کہیں "باہر" سے ہو، ٹھکرا دینے میں کوئی تامل نہیں کرتا، اور علمائے یہود کی طرح دوسروں کو بھی یہ تلقین کرنے لگتا ہے کہ وَلَا تُؤْمِنُوْا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ (صرف اسی شخص کی بات مانو جو تمھارے اپنے مذہب کا پیرو ہو)

ایسی خطرناک بیماری کا جو گروہ شکار ہو جائے، اس سے یہ توقع نری حماقت ہی ہوگی، کہ اس کی کوششوں سے دین حق کو فروغ حاصل ہو سکے گا۔ جن لوگوں کی نگاہ میں جماعتی رشتوں اور جھوٹے گروہی وقار کو یہ مقام حاصل ہو، اور جو سچائی کے اعتراف میں "اپنے" اور "غیر" کا امتیاز روا رکھتے ہوں، وہ دراصل اپنے گروہ کا کلمہ بلند کرنا چاہتے ہیں۔ جھوٹ کہتے ہیں، اگر کہتے ہیں کہ ان کا مقصد اللہ کا کلمہ بلند کرنا ہے۔ کوئی شخص اپنے خدا اور اپنے گروہ دونوں کی "پوجا" ایک ساتھ نہیں کر سکتا۔

۶۔ آزادی رائے کا غلط استعمال

چھٹا اہم عامل آزادی فکر و رائے کا غلط استعمال ہے۔

یہ غلط استعمال جب ایک خاص حد سے آگے بڑھ جاتا ہے، تو تحریک، طوائف الملوکی کا شکار ہو جاتی ہے۔ اور طوائف الملوکی وہ بلا ہے جس کی موجودگی میں اس بات کی کوئی امید نہیں رہ جاتی کہ تاریخ صحیح رخ پر ایک قدم بھی آگے بڑھ سکے گی۔ آگے بڑھ سکنے کا کیا سوال، وہ تو الٹا پیچھے کی طرف تیزی سے لڑھکنے لگے گی، جیسے چڑھائی پر جاتی ہوئی کسی ٹرین کا انجن اس سے کٹ کر الگ ہو گیا ہو۔

بلاشبہ غور و فکر کی قوت ہی انسان کا امتیازی جوہر ہے۔ اس لیے اس امر میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ اس قوت کا استعمال ہر شخص کا پیدائشی حق ہے، جس سے اس کو کسی حال میں بھی محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح جو شخص اپنے اس حق کو از خود استعمال نہیں کرتا، وہ فی الواقع اپنے آپ کو انسانیت کے مقام سے گرا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے، جو دین فطرت ہے، اپنی سوجھ بوجھ سے کام لینے کو انسان کے بنیادی حقوق ہی میں نہیں، بلکہ اس کے بنیادی فرائض میں بھی شمار کیا ہے۔ وہ اس شخص کو جو عقل و فہم سے کام نہ لے کالانعام، (جانوروں کے مشابہ)، کہتا ہے۔ اور اس شخص کو، جو جانتے بوجھتے بھی حق بات ظاہر کرنے سے کنی کاٹ جائے، (گونگا شیطان) قرار دیتا ہے۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہ مقام اس نے عقل و فہم اور آزادی فکر و رائے کے صحیح، محتاط اور ذمہ

دارانہ استعمال کو دیا ہے نہ کہ غلط اور بے لگام استعمال کو۔ عقل و رائے کا غلط استعمال تو اس کے یہاں اتنا ہی مذموم ہے جتنا اس کا عدم استعمال مذموم ہے۔ چنانچہ اس نے ایسے وقت کو امت کے لیے انتہائی برا وقت بتایا ہے جب اس کے افراد سے، اپنے حدود بھول کر آزادی فکر و رائے کے غیر ذمہ دارانہ استعمال میں، چھوٹ ہو جائیں اور ہر شخص اپنی رائے کا پرستار بن جائے۔ اور اس کے نتیجے میں ہر طرف ایک ذہنی انار کی پھوٹ پڑے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تنبیہہ کے انداز میں فرماتے ہیں: یہاں تک کہ جب تم دیکھو کہ بخل کا ہر طرف غلبہ ہے، زمام کار نفس کی خواہشوں کے ہاتھ میں ہے۔ دنیا کو دین پر مقدم رکھا جا رہا ہے۔ اور ہر رائے والا اپنی ہی من مانی رائے پر فریفتہ ہے۔ ساتھ ہی تمہیں یہ محسوس ہو رہا ہے، کہ تم خود بھی ان میں سے کسی برائی میں مبتلا ہو رہے ہو، تو پھر بس اپنی ہی فکر میں لگ جاؤ۔ اور دوسروں کو اپنے حال پر چھوڑ دو۔

خط کشیدہ الفاظ پر ٹھہر کر غور کیجیے! ان الفاظ میں بات صرف اتنی ہی نہیں کہی گئی ہے کہ جب ہر شخص اپنی رائے پر فریفتہ ہو، بلکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ جب ہر رائے والا اپنی رائے پر فریفتہ ہو، گویا یہ صورت حال بھی کہ، ہر رائے رکھنے والا اپنی ہی رائے پر فریفتہ ہو رہے، ایک مخلص مسلمان کو امر بالمعروف اور اصلاح امت کے معاملے میں ہمت ہار جانے پر، حق بجانب قرار دے دیتی ہے۔ پھر اس صورت حال کا تقاضا کیا کچھ نہ ہو گا جب ہر شخص خواہ وہ رائے قائم کرنے کی صلاحیت رکھنے والا ہو، یا نہ ہو، ایک رائے ظاہر کر کے اسی پر فریفتہ ہو رہے، اور اسی پر اڑ جانے کا وطیرہ اختیار کر لے۔

یہ تو مرض کی وہ انتہا ہے جس کے علاج کی ہمت ایک عام انسان کسی حال میں بھی نہیں کر سکتا۔ فکر و رائے کی آزادی کا غیر محتاط اور غیر ذمہ دارانہ استعمال کتنا خطرناک فتنہ ہے، اس حکیمانہ ارشاد نبویؐ سے اس کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

دراصل کسی بھی جماعت کے لیے یہ قطعی ضروری ہے، کہ اس کے افراد کے اندر رائے میں کسر و انکسار کی پوری صلاحیت موجود ہو۔ کوئی شخص اگر ضروری غور و فکر کے بعد ایک رائے پر پہنچ جائے، تو اسے اس بات کا تو پورا حق حاصل ہے کہ وہ مناسب موقع پر اس کو دلائل کے ساتھ پورے زور سے پیش کرے۔ مگر اسے یہ حق ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا کہ تمام لوگوں سے، اسی کو بہرحال صحیح اور برحق تسلیم کر لینے پر اصرار کرے۔ اس کے بخلاف اسے اس امکان کو لازماً سامنے رکھنا چاہیے کہ اس کی رائے غلط بھی ہو سکتی ہے، اور دوسروں کی صحیح۔ ہو سکتا ہے، کہ اس کی نگاہ زیر بحث مسئلہ کے سارے گوشوں پر نہ پہنچ رہی ہو، یا دوسرے لوگ اپنی رائے کے حق میں جو دلیلیں دے رہے ہیں، کسی وجہ سے ان کا ٹھیک ٹھیک وزن وہ محسوس نہ کر پا رہا ہو۔

ان تمام امکانات کالحاظ رکھنے کے باوجود بھی اگر وہ اپنی رائے کے درست ہونے پر آخر وقت تک مطمئن رہے، لیکن دوسرے شرکاء مشورہ کو اپنی اس رائے سے متاثر و متفق نہ بنا سکے، اور کثرتِ رائے سے فیصلہ اس کے خلاف ہو رہا ہو، تو اسے اب پوری فراخ دلی کے ساتھ اس فیصلہ کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینا اور عمل کی حد تک اپنی رائے سے دست بردار ہو جانا چاہیے۔ اِلاّ آنکہ یہ فیصلہ بالفرض تحریک کے اصول و مقاصد تک کو علانیہ ختم کر دینے والا ہو، اور اس کے سلسلہ میں خدانخواستہ اسلام کی منصوص ہدایات تک پسِ پشت ڈال دی گئی ہوں۔ لیکن جب تک نوعیت اجتہادی اختلافات ہی کی ہو، اسے ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ بدستور اپنی رائے پر جما رہے۔ ورنہ اس تحریک اور جماعت کا مستقبل کبھی روشن نہیں ہو سکتا جس کے افراد اجتماعی فیصلوں کے مقابلہ میں اپنے ذوق و رجحان ہی کو نہیں، بلکہ اپنی سوچی سمجھی رائے کو بھی قربان کر دینے کے لیے تیار نہ ہوں۔ آخر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کس بشر کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی رائے اور صواب دید کو فیصلہ کن سمجھے۔ مگر ہمیں معلوم ہے کہ آپؐ نے بھی کئی بار دوسروں کی رائے کے مقابلہ میں اپنی رائے ترک کر دی تھی۔ حالانکہ اگر آپؐ تمام کے تمام صحابہؓ کی متفقہ رائے کے خلاف بھی کوئی فیصلہ صادر فرما دیتے، تو ایک شخص بھی اس کی پیروی سے انکار نہ کرتا۔ پھر کسی زید یا بکر کو اپنی رائے پر ایسے اصرار کا استحقاق کہاں سے حاصل ہو سکتا ہے کہ گویا وہ کوئی انسانی رائے نہیں ہے، بلکہ آسمانی وحی ہے جس کے ساتھ تنقید اور انکار کا رویہ اگر اپنایا گیا تو اسلام اور ایمان کا سررشتہ ہی ہاتھ سے چھوٹ جائے گا۔

غرض آزادی فکر و رائے اور چیز ہے، اور رائے پرستی و خود پسندی دوسری چیز۔ آزادی فکر و رائے کے صحت مندانہ استعمال کی شکل میں اسلامی تحریک کی ساری توانائی اپنے مقابل محاذ پر --- باطل کے خلاف --- صرف ہوتی رہتی ہے، اور اس کے قدم مضبوطی کے ساتھ آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ مگر رائے پرستی و خود پسندی کے زہر سے مسموم تحریک و جماعت کی قوتیں، پورس کے ہاتھیوں کی طرح خود اپنے ہی مورچہ پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔ جس کے نتیجے میں تحریک اپنے ہی "غازیوں" کے ہاتھوں "شہید" ہو جاتی ہے۔

چنانچہ امت کی تاریخ اس حقیقت کی شہادتوں سے بھری پڑی ہے۔ یہ جو آپ دیکھ رہے ہیں، کہ خلافت راشدہ کے اختتام سے پہلے ہی امت کے درمیان اختلاف و نزاع کی جو تلوار نکل پڑی تھی، وہ آج تک نیام میں واپس نہیں جا سکی ہے، اور جو دین، وحدتِ فکر و عمل کا نقیب بن کر آیا تھا، آج اس کے ماننے والے ستر، بہتر ٹکڑیوں میں بکھرے پڑے ہیں، تو اس نادیدنی صورتِ حال کا ایک اہم سبب اختلافی امور و مسائل میں یہی رائے کا بے جا اصرار بھی ہے۔

ہوتے ہوتے یہ ذوق اتنا پختہ ہو چکا ہے، کہ اب ثانوی اہمیت کے چند مخصوص افکار و مسائل کی حفاظت ہی شہادت حق کے ہم معنی ہو کر رہ گئی ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ رائے پرستی کے مریض اشخاص کو عموماً اپنے مریض ہونے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ وہ اس مرض ہی کو تندرستی کی سند خیال کر لیتے ہیں۔ انھیں کچھ اس طرح کا وہم ہو جاتا ہے۔ کہ اپنی فلاں رائے یا صواب دید کو چھوڑ دینا گویا استقامت علی الحق کے مقام سے گر جانا ہے۔

رائے پرستی کا یہ مرض جب اس شدت کو پہنچ جاتا ہے، تو ان کا ایک ایک سانس اختلاف و انتشار کے مہلک جراثیم اگلنے . . ہے، اور معاشرہ ارجانی فتنوں کی آماج گاہ بن جاتا ہے۔ ۔ ۔ کہنے کو تو ایک ہی منزل اور ایک ہی راہ کا متحد الاقدام قافلہ، مگر حقیقت میں الگ الگ وادیوں اور بھٹکنے والے مسافروں کی الگ الگ ٹولیاں، اور ہر ٹولی، كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (اور ہر ٹولی اپنے اپنے کام پر خوش) کی مصداق یقیناً ایسی خوف ناک ذہنیت اور کج روی سے ہر اس تحریک کو ہزار بار اللہ کی پناہ مانگتے رہنا چاہیے، جو اللہ کے دین کو از سر نو زندہ کرنے، اور اسے کتاب و سنت کے اوراق سے لے کر زندگی کے پھیلے ہوئے میدان میں اس کی پوری روح اور مکمل ہیئت کے ساتھ برپا کر دینا چاہتی ہو۔

بنگلہ دیش پر
مغربی استعمار کی نئی یلغار

مسلم سجاد

زمانہ بدلا، تو مغربی عیسائی استعمار نے اپنا روپ اور اپنے طور طریقے بھی بدل دیے۔ مسلمانوں پر تسلط رکھنے کے لیے ان کو براہ راست اپنے قبضہ میں رکھنا ممکن نہ رہا، تو پرانے شکاریوں نے نئے جال بچھا دیے۔ پہلے فکر معاش دے کر روح قبض کی، پھر ترقی معاش کے سراب کا دیوانہ بنایا، اور پھر امداد اور قرضوں کے سنہری تاروں میں باندھ کے بے دست و پا کر دیا۔ افسوس کہ فرعون کو کالجوں اور بہبود آبادی کی نہ سوجھی، ورنہ مفت میں قتل اولاد کے لیے بدنام نہ ہوتا۔

ایک نیا سنہری جال این جی اوز NGOs یا نان گورنمنٹل آرگنائزیشن کا، یعنی غیر سرکاری تنظیموں کا ہے۔ ترقی و تعلیم، فلاح و بہبود اور ریلیف کے نام پر این جی اوز کس طرح ایک پس ماندہ مسلمان ملک کو اپنے شکنجہ میں کس لیتی ہیں، اس کی ایک مثال بنگلہ دیش ہے۔ کیوں کہ بنگلہ دیش خانہ جنگی اور بڑی تباہ کاری کے نتیجے میں بنا، اس لیے وہاں کی زمین ترقی و بہبود کے بھیس میں کام کرنے والی ان تنظیموں کے لیے کچھ زیادہ ہی زرخیز ثابت ہوئی۔ حکومت بنگلہ دیش نے ان تنظیموں کو قواعد و ضوابط کا پابند بنانے کا سوچا، اور ان کی نگرانی کے لیے ایک این جی اوز بیوریو قائم کیا۔ مگر یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی، اور جلد ہی اس کو مغرب کے "فیاض و مخیر" ممالک کے آگے گھٹنے ٹیکنا پڑے۔ لیکن خوش قسمتی سے اس کے نتیجے میں ان تنظیموں کے بارے میں قیمتی معلومات جمع ہو گئیں۔ پاکستان، ہمارے علم کی حد تک، ان معلومات سے بھی محروم ہے۔ بنگلہ دیش میں این جی اوز کے تاریک سایوں کے بارے میں ہم امپیکٹ انٹرنیشنل، لندن کے شکریہ کے ساتھ ان کے مضمون کا ملخص ترجمہ ذیل میں شائع کر رہے ہیں۔ (مدیر)

اگست ۱۹۸۹ ڈھاکا کے اخباروں نے سنسنی خیز سرخیاں لگائیں : "حکومت نے بدطینت اور بدعنوان این جی اوز کے آگے ہتھیار ڈال دیے"، "ایسٹ انڈیا کمپنی واپس آگئی ہے"، "ہماری آزادی پر نقب لگانے کا منصوبہ"۔

ہوا یہ تھا کہ این جی اوز بیورو کے ڈائریکٹر جنرل نے دو تنظیموں کی رجسٹریشن منسوخ کر دی تھی۔ ایک ادب (ADAB)، یعنی ایسوسی ایشن آف ڈویلپمنٹ ایجنسیزان بنگلہ دیش جسے قانون کی خلاف ورزی کا مرتکب اور سیاسی سرگرمیوں میں ملوث پایا گیا تھا۔ دوسری سیبا (SEBA)، یعنی سوسائٹی فار آرگنانک اینڈ بیک ایڈمنسٹریشن جو خورد برد اور بغیر اجازت ایک غیر ملکی سفارت خانہ سے رقوم وصول کرنے کی مرتکب تھی۔ یہ فیصلہ وزیراعظم سیکرٹریٹ میں کیا گیا، لیکن مغربی سفارت خانے فوراً حرکت میں آئے اور تین گھنٹے کی مختصر مدت میں "ادب" اور "سیبا" دونوں اپنے کام پر واپس آگئیں۔

حال میں یہ کہانی ایک مرتبہ پھر دہرائی گئی، جب این جی او بیورو نے خورد برد اور پیسہ دے کر لوگوں کا مذہب تبدیل کرانے پر انٹرنیشنل کرسچین فیلوشپ اور بعض دوسری تنظیموں کا رجسٹریشن منسوخ کردیا۔ سرپرست سفیران کرام کا ایک وفد فوراً وزیراعظم کے پاس پہنچ گیا، اور انھیں بتایا کہ "اگر ان اداروں کو بحال نہیں کیا گیا تو حکومت کی امداد روکی جا سکتی ہے"۔ خالدہ ضیا جانتی تھیں کہ یہ خالی خولی دھمکی نہیں۔ احکام واپس لے لیے گئے، اور بیورو کے ڈائریکٹر جنرل، شاہد العالم کا فی الفور تبادلہ کر دیا گیا۔

اخبارات ہی نہیں، بنگلہ دیش کے عوام بھی کئی مقامات پر ان تنظیموں کے خلاف غصہ سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے سڑکوں پر نکل کر بڑے بڑے مظاہرے کر چکے ہیں۔ لیکن یہ کوئی ایسی کہانی نہیں جو حکومت کے علم میں نہ ہو۔ اس کی فائلوں میں سب معلومات موجود ہیں۔ بات یہ نہیں کہ وہ کچھ کرنا نہیں چاہتی، بلکہ وہ بے بس ہے اور کچھ کر نہیں سکتی۔

تعداد اور وسائل

بنگلہ دیش ان ملکوں میں سرفہرست ہے جہاں چپہ چپہ پر بیرونی این جی اوز کا جال بچھا ہوا ہے۔ ملک بھر میں ان کی تعداد ۱۶ ہزار ہے، یعنی اوسطاً ہر ۳۵ مربع میل میں ایک۔ این جی اوز کی کل آمدنی کے بارہ میں صحیح اعداد و شمار میسر نہیں۔ اس لیے کہ، حکومت کے ضابطوں کے باوجود، یہ اپنے تمام وصول کردہ فنڈز ظاہر نہیں کرتیں۔ ۱۹۸۴ میں صرف عیسائی تنظیموں کی سالانہ ظاہر کردہ آمدنی ۸ کروڑ ۴۰ لاکھ ڈالر تھی۔ لیکن ورلڈ بنک، ایشین ڈویلپمنٹ بنک اور دوسرے امدادی ادارے ان تنظیموں کو اس سے کہیں زیادہ رقوم فراہم کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ، این جی اوز کو ان کی حکومتیں براہ راست بھی فنڈز فراہم

کرتی ہیں۔ مزید ستم یہ کہ مختلف ملک اور ادارے جو امداد بنگلہ دیش کو دیتے ہیں، اس میں یہ شرط لگا دیتے ہیں کہ اس امداد کا ایک مخصوص حصہ ان کی نامزد کردہ این جی اوز کے ذریعہ ہی خرچ کیا جائے گا۔ مثلاً، امریکا یہ پابندی لگاتا ہے کہ فوڈ فار ورک (کام کے بدلہ غذا) پروگرام کی رقوم ایک عیسائی خیراتی ادارہ کیئر (Care) کے ذریعہ ہی خرچ کی جائیں گی۔

ان تنظیموں کو ملنے والی بھاری رقوم کا بڑا حصہ ان کے اپنے ہی اللوں تللوں میں اڑا دیا جاتا ہے۔ ۶۰ فی صد فنڈز غیر ملکی رضاکاروں، ماہرین اور مشیروں کی بھاری تنخواہوں اور سہولتوں پر لگ جاتے ہیں، ۱۰ فی صد دفتری اخراجات پر جبکہ بنگلہ دیشی عملہ کے حصہ میں ۱۵ فی صد آتا ہے، مگر جن غریبوں کے درد میں یہ تنظیمیں میدان میں آئی ہیں ان کو مشکل سے ۵ فیصد نصیب ہوتا ہے۔ جس ملک میں ماہانہ آمدنی ایک ہزار ٹکا (۲۵ ڈالر) سے مشکل ہی سے بڑھ پاتی ہے، وہاں کچھ این جی اوز کے سربراہ ایک لاکھ سے تین لاکھ ٹکا تک تنخواہ وصول کرتے ہیں۔ بڑی بڑی رقمیں نئے نئے ماڈل کی کاروں اور افسران کے لیے فائیو اسٹار ریسٹ ہاؤسوں کی تعمیر پر خرچ کی جاتی ہیں۔ پلاننگ کمیشن کے ممبر، ڈاکٹر شیخ مقصود علی کی رائے میں این جی اوز کے ترقیاتی بجٹ کا ۸۰ فی صد مستحقین کو پہنچنے کے بجائے انھیں پہنچانے والوں پر خرچ ہو جاتا ہے۔ پلاننگ کمیشن کے سامنے پیش کیے گئے منصوبوں میں اکثر اعداد و شمار غلط ہوتے ہیں، اور زمین، دفاتر اور رسل و رسائل کی مدوں میں تخمینہ اصل سے کہیں زیادہ ظاہر کیا گیا ہوتا ہے۔

اخراجات کی مدوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اکثر این جی اوز اپنے فنڈز اعلان کردہ منصوبوں سے ہٹ کر دوسرے منصوبوں پر خرچ کرتی ہیں۔ این جی اوز بیورو کے آڈیٹروں نے ۱۰۰ تنظیموں کے حسابات دیکھے تو ۸۰ فی صد میں مالی بدعنوانیوں، کرپشن اور خفیہ بنک اکاؤنٹوں کا انکشاف ہوا۔ ایک تنظیم نے تقریباً ۳۰ لاکھ ٹکا ریلیف ورک کے لیے نکالے، لیکن صرف ۳۲ ہزار ۲ سو ٹکا تقسیم کیے۔ دو اور این جی اوز کے حسابات میں سائیکلون ریلیف کے بہانہ ۵۰ لاکھ اور ایک کروڑ ٹکا کی رقمیں غلط مدوں میں خرچ کی گئیں۔

این جی اوز اپنے فنڈز کے ذریعہ سیاسی اثر و رسوخ بھی خریدتی ہیں۔ سرکاری افسروں سے بنگلے اونچے اونچے کرایوں پر حاصل کیے جاتے ہیں، اور ان کے بچوں، بھانجوں اور بھتیجوں کو بے نام کی عمدہ ملازمتیں دی جاتی ہیں۔

ان این جی اوز کا اپنے بارہ میں پھیلایا ہوا امیج (تاثر) یہ ہے کہ وہ "دنیا کے غریب ممالک میں غربت دور کرنے اور تعلیم و ترقی عام کرنے میں مقامی حکومتوں اور عوام کی شریک کار ہیں"۔ لیکن بنگلہ دیش کے چوٹی کے ماہرین معاشیات کی رائے ہیں: "ان کے ملک میں طاقت ور اور مال دار مغربی شرکائے کار کے ارتکاز کے باوجود، حقیقی ترقی میں ان کا حصہ نہ صرف بہت کم، بلکہ سماجی لحاظ سے منفی ہے۔"

ڈاکٹر شیخ مقصود علی پلاننگ کمیشن کے رکن ہیں۔ انھیں ایسی کوئی شہادت نہیں ملی کہ بھاری فنڈز دینے کے باوجود ان علاقوں میں لوگوں کی شرح آمدنی میں کوئی اضافہ ہوا ہو جہاں این جی اوز نے اپنے منصوبے شروع کر رکھے ہیں۔ ڈاکٹر سید مصباح الدین، جہانگیر نگر یونیورسٹی میں معاشیات کے پروفیسر ہیں۔ ان کے بقول بھی ترقی کے دو اہم سیکٹروں، یعنی زراعت اور صنعت میں این جی اوز کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

ان کی ایک سرگرمی، چھوٹے کاروبار کے لیے قرض دینے کی بھی ہے۔ لیکن واپسی کا نظام ایسا ظالمانہ ہے کہ قرضہ دار ۲۰ سے ۳۰ فیصد سود ادا کرتا ہے۔ ایک تنظیم ۲۲۶ فیصد سود حاصل کر لیتی ہے۔ این جی اوز بیورو کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ یہ تنظیمیں غریبوں کی محتاجی ختم کرنے کے لیے شاذ ہی کام کرتی ہیں۔ بیشتر غریبوں کے حقیقی مسائل سے بے نیاز ہوتی ہیں اور انھیں ان لوگوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ نیمی اور مانک گنج کی بعض آبادیاں ان غیر ملکی تنظیموں کی اتنی محتاج ہو گئی ہیں کہ عملاً ان کی رعایا بن کر رہ گئی ہیں۔ کئی بنگلہ دیشی مبصرین کی رائے میں یہ شکنجہ تو روایتی ہندو بنیے کے شکنجہ سے بھی زیادہ خوفناک اور خطرناک ہے۔

عیسائیت مذہبی اور سماجی تبدیلی کا منصوبہ

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ این جی اوز دراصل کیا کام کر رہی ہیں؟ ایک سیاسی و سماجی انقلاب برپا کر کے "روشنی اور تہذیب" لانا، اور "تاریک اور شب گرفتہ" مسلم بنگال کی دھرتی پر تعمیر و ترقی کی چکاچوند کرنا!

این جی اوز کی بڑی تعداد عیسائی مشنریوں پر مشتمل ہے، اگرچہ بالعموم ان کے ناموں سے یہ حقیقت ظاہر نہیں ہوتی۔ ان میں سے کچھ تو علانیہ کہتی ہیں کہ وہ انجیلی ہیں، جبکہ اکثریت کی مثال خیمے کی "کھونٹیوں" جیسی ہے۔ یہ "کھونٹیاں" اپنے طریقۂ واردات میں بے حد عیار اور چالاک ہیں۔ یہ اپنے مبلغ ہونے کا اظہار نہیں کرتیں، بلکہ سماجی کارکن، تاجر انجینئر اور ڈاکٹر کے بھیس میں اپنا کام کرتی ہیں۔

بنگلہ دیش میں مشنریوں کی سرگرمیوں کا آغاز ۱۷۵۷ کی جنگ پلاسی سے ہوا۔ ۱۹۴۷ میں عیسائیوں کی تعداد ۵۰ ہزار تھی، مئی ۱۹۷۱ میں یہ تعداد چار گنا ہو کر دو لاکھ تک پہنچ گئی، اور ۱۹۹۱ میں یہ تعداد دگنی ہو کر چار لاکھ تک پہنچ گئی ہے۔ این جی اوز کا ہدف اگلے ۲۰ سال میں اس تعداد کو ایک کروڑ تک پہنچانا ہے۔

"اسد ایونیو" زیادہ تر نئے عیسائیوں کی ملکیت ہے، اور میرپور "گرجوں کا شہر" بن چکا ہے۔ تشویشناک امر یہ ہے کہ مسلمان بھی عیسائی بن رہے ہیں۔ انڈونیشیا کی طرح اب بنگلہ دیش بھی یہ رائے

ظاہر کرتا ہے کہ یہ رائے صحیح نہیں ہے کہ ایک مسلمان، عیسائی نہیں بن سکتا۔ ایک "متزلزل مسلمان" کو اب پہلے سے کہیں زیادہ آسانی کے ساتھ "متزلزل عیسائی" بننے کی طرف مائل کیا جا سکتا ہے۔

بنگلہ دیش بنا تو اس نے خود کو ان بین الاقوامی طاقتوں کی گود میں پایا، جن کا اپنا معاشی، سیاسی اور مذہبی ایجنڈا تھا۔ وہ اس کی کمزوریوں سے فایدہ اٹھانے کی خواہاں تھیں اور اس کی سماجی، معاشی اور سیاسی ساخت کو اس حد تک کمزور کرنا چاہتی تھیں کہ جہاں قوم خود بخود ایک نئی نو آبادیاتی نوکری میں جا گرے۔ ڈھاکہ میں ینگ مینز کرسچین ایسوسی ایشن (وائی ایم سی اے) کے جاری کردہ کتابچے "عوام سے عوام تک" میں لکھا ہے: "بنگلہ دیش کے سماجی ڈھانچے کو تعلیمات انجیل کے مطابق ڈھالنے کے عمل میں عیسائی تحریک کو لازماً ایک بھرپور قوت ہونا چاہیے"۔

بنگلہ دیش میں سرگرم عمل غیر ملکی فلاحی تنظیموں کے مقاصد میں کسی قسم کا کوئی ابہام یا اختلاف نہیں ہے۔ کسی کا مطمح نظر فلاح و بہبود نہیں ہے، سب کا مقصد یہ ہے کہ قوم کے سماجی ڈھانچے کو تبدیل کیا جائے۔

این جی اوز بیورو نے ایسی ۵۲ این جی اوز کی نشاندہی کی ہے جو براہِ راست لوگوں کو عیسائی بنانے میں مصروف ہیں۔ مگر مذہبی اور سیکولر این جی اوز میں فرق صرف ظاہری وضع کا ہے، مقاصد کا نہیں۔ سیکولر این جی اوز مذہبی لحاظ سے غیر جانبدار ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں، مگر معاشرے کی روح اور اقدار کو بگاڑنے میں معاونت کرتی ہیں۔ جب کہ مشنری این جی اوز کھلے بندوں تباہ حال روحوں کی پکی فصل کاٹنے کے لیے کوشاں ہیں۔

این جی اوز بیورو رپورٹ نے ان کے طریقوں کی ایک دلچسپ اندرونی تصویر پیش کی ہے۔ مذہب کی تبدیلی اور عیسائی بنانے کے لیے کمزوروں کا انتخاب کیا جاتا ہے یعنی عورتیں، بچے، ان پڑھ یا بے یار و مددگار اور غربت کے شکنجے میں جکڑے ہوئے بے بس اور محروم لوگ۔ کچھ این جی اوز مسلمان سمیت اپنے تمام عملے کے لیے بائبل پڑھنا لازمی قرار دیتی ہیں۔ ایک بڑی مشنری این جی او نے اپنے قائم کردہ اسکولوں میں صرف عیسائی اساتذہ مقرر کیے ہیں اور ہوسٹل میں رہنے کے خواہش مند طلبہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ عیسائی ہوں۔ اکثر مشنری سکولوں میں طالب علموں کے لیے عیسائیت پڑھنا لازمی ہے۔ ایسے ہی ایک کیس میں جب ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر نے اس بے ضابطگی کی طرف توجہ دلائی تو اسے جواب ملا: "ہمیں آپ کی حکومت فنڈ نہیں دیتی ہے نہ ہم اس کے سامنے جواب دہ ہیں"

اکثر عیسائی این جی اوز کی پالیسی ہے کہ "مسلمان کو آخر میں ملازمت دو اور نئے عیسائی کی دستگیری کرو"۔ اس پالیسی کا مقصد معاشی اور تعلیمی لحاظ سے ایک موثر عیسائی طبقہ پیدا کرنا ہے جو، افریقہ کے بہت

سے خطوں کی طرح، آگے چل کر یہاں بھی طاقت کے کلیدی سیکٹروں پر کنٹرول حاصل کر سکے۔ جیسے تعلیم، معیشت، بیوروکریسی، فوج اور سماجی پالیسی وغیرہ۔

خواتین میں تبلیغی کام "پروگرام برائے سماجی بیداری" کا نقاب اوڑھ کر کیا جاتا ہے۔ سماجی بیداری کا یہ پروگرام خواتین سے اسلامی ثقافت اور خاندانی اقدار چھڑا کر انھیں "آزادی نسواں" اور ضبطِ تولید کی آزاد اور ڈھیلی ڈھالی اخلاقیات سے متعارف کرواتا ہے۔ چھوٹے بچوں کو خریدنے کا کاروبار بھی خاموشی سے جاری و ساری ہے۔ ان بچوں کو عیسائی بنا کر باہر بھیج دیا جاتا ہے۔

تاہم غور کرنے کی بات یہ ہے کہ وائی ایم سی اے، جس تبدیلی کی خواہاں ہے، وہ پہلے سماجی ڈھانچے میں رونما ہوگی یا پہلے ملک کا "سیاسی ڈھانچہ" تبدیلی کے عمل سے گزرے گا۔

سیاسی تبدیلی کا منصوبہ

ان تنظیموں کا ایک اور رول ایسے پریشر گروپس قائم کرنا، اور انھیں فنڈ فراہم کرنا ہے، جو سیاست میں سیکولر اور غیر اسلامی عناصر کے حق میں اور اسلامی اور قوم پرست طاقتوں کے خلاف اثرانداز ہوں۔ امداد عوام تنظیم (GSS) کو اوکس فیم (Oxfam) کی سرپرستی حاصل ہے، اس نے جو تعلیمی نوازمہ تیار کیا ہے، وہ اسلام دشمنی اور ہندونوازی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ایک اور ادارہ ناتیجرا کوری (NK) ہے، جسے متنازعہ سیاسی مسائل میں کوئی موقف اختیار کرنے اور سرکاری ہدایات کی خلاف ورزی میں کوئی تامل نہیں ہے۔ NK کو War on Want اور Christian Aid جیسے متعدد بیرونی اداروں کا تعاون حاصل ہے، اور حکومت نے بھی بے گھر لوگوں کے منصوبوں کے لیے اسے بڑے بڑے قطعات اراضی لیز پر دے رکھے ہیں۔ ایسے حکومت کی منظوری اور علم کے بغیر فنڈز فراہم ہوتے ہیں۔ یہ سب این جی اوز بھارت نواز، متشدد، سیکولر، اسلام دشمن اور طبقاتی اور جنسی تفریق کو بڑھانے والے ہیں۔

تنظیمیں پریشر گروپ کی بالواسطہ حکمت عملی کے ساتھ ساتھ، ملک کی سیاست میں براہ راست بھی دخل دے رہی ہیں۔ بیورو کی رپورٹ کے مطابق ایسی ۱۶ غیر ملکی تنظیمیں سیاسی طور پر سرگرم ہیں، جو رسالے اور خبرنامے جاری کرتی ہیں، سیاسی موقف اختیار کرتی ہیں، اور اسلامی قوانین پر تنقید کرتی ہیں، اپنی پسند کی سیاسی پارٹیوں کو رقوم فراہم کرتی ہیں، بلدیاتی انتخابات میں اپنے من پسند امیدوار کھڑے کرتی ہیں۔ قومی اسمبلی کے انتخابات میں بھی انھوں نے اپنی پسند کے امیدواروں کی حمایت کی۔

بنگلہ دیش کے سیاسی مبصرین کے خیال میں چٹاگانگ کے پہاڑی علاقوں کی سیاست میں این جی اوز کی براہ راست مداخلت حد درجہ بڑھ گئی ہے، اور اس سے بھارت کے حمایت یافتہ گروپ شانتی

باہنی (امن کور) کی شورش کو شہ ملی ہے۔ این جی اس خطے کی صورتحال جنوبی سوڈان سے کسی حد تک ملتی جلتی ہے، جہاں این جی اوز نے بہبود فراہم کرنے والے اور باغیوں کے "انسانی حقوق کے محافظوں" کے طور پر خود کو تعینات کر رکھا ہے۔ یہ این جی اوز، مغربی سفارت خانوں، امریکی کانگریس مینوں اور انسانی حقوق کی مغربی لابیوں کو متحرک کرنے میں شانتی باہنی کی مدد کرتی ہیں، تاکہ وہ بنگلہ دیشی حکومت پر اپنا دباؤ بڑھائیں۔ شانتی باہنی کا خفیہ خبرنامہ "راڈار" (Radar) ایسے مواد پر مشتمل ہوتا ہے جو کسی این جی او نے فراہم کیا ہوتا ہے۔ اگر برطانوی ہائی کمشنر بنگلہ دیش کے وزیر خارجہ کو خط لکھتا ہے تو اسے "راڈار" میں پڑھا جا سکتا ہے۔

بیرونی مداخلت

گزشتہ برس اپریل میں خبر آئی کہ حکومت این جی اوز کے کام کو ضابطہ میں رکھنے والے قوانین میں اس نقطہ نظر کے ساتھ ترمیم کر رہی ہے، تاکہ غیر ملکی فلاحی اور امدادی ادارے ملکی مفاد کے منافی سرگرمیوں اور ملکی سیاست میں ملوث ہونے سے باز رہیں۔

اسی روز ڈھاکا میں امریکی سفیر نے ایک ظہرانے میں کہا: "طاقت کے متنوع مراکز کے بارے میں مشتبہ ہونے کی ضرورت نہیں، جیسے کہ این جی اوز وغیرہ، اور نہ ہی ان سے دشمنوں جیسا سلوک کرنا چاہیے۔ ہمارے تجربے کے مطابق تو این جی اوز بہتر کام اور معاشرے کی بہتر خدمت کر سکتی ہیں بشرطیکہ انھیں کم سے کم کنٹرول کیا جائے۔" امریکی سفیر نے یہ بھی کہا: "مختلف گروپوں مثلاً بزنس ایسوسی ایشنز، این جی اوز اور ٹریڈ یونینوں کو حکومت کا مخالف ہونا چاہیے نہ حکومت کا حامی"۔

امریکی سفیر کی طرف سے "طاقت کے مختلف مراکز" کا نظریہ پیش کرنے کے بعد عالمی بنک کے مقامی نمایندے نے این جی اوز کے کردار میں توسیع کا مطالبہ کیا اس کے مطابق: (۱)۔ امداد دینے والے ممالک چاہتے ہیں کہ این جی اوز ملکی ترقی میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں اور (۲) وہ امداد باہمی کی کاروائیوں اور پروگراموں کو پایہ تکمیل تک پہنچانا چاہتے ہیں کیونکہ حکومتی اداروں کی کارکردگی تسلی بخش نہیں۔ لیکن این جی او "ادب" کی کوارڈی نیٹر مس خوشی کبیر نے کہا ہے کہ یہ قانون "گھٹن کا ماحول پیدا کر دے گا اور اس بات کو ناممکن کر دے گا کہ این جی اوز ترقیاتی کام چلا سکیں۔" اس تنبیہہ کے ساتھ ساتھ مس خوشی کبیر نے مجوزہ قانون کو رد کرتے ہوئے کہا ہے کہ "یہ قانون حکومت کی آزاد روی کی پالیسی اور جمہوری عمل کو فروغ دینے کے اعلان سے مطابقت نہیں رکھتا۔"

سائنس اور آج کی دنیا

عبدالقدیر سلیم

ہماری یہ دنیا، جس میں آج ہم رہ رہے ہیں، علمی اور فکری طور پر کس طرح تشکیل پذیر ہوئی، اس کی داستان تو بہت طویل ہے۔ اس کی بنیاد میں خشت چین بھی ہے، اور سنگ یونان بھی، رومی اور ہندی فکر و تہذیب کے کچھ اثرات بھی ہیں، اور اسلام کے سیل رواں کے کچھ باقیات بھی۔ لیکن آج کے تہذیب و تمدن کا غالب خمیر جس فکر سے صورت پذیر ہوا ہے، اس کا مطالعہ دلچسپ بھی ہے، اور فکر انگیز بھی۔ حال ہی میں برطانوی مصنف ریان اے پل یارڈ کی کتاب Understanding the Present منظر عام پر آئی، تو علمی حلقوں میں ایک ہل چل سی مچ گئی۔ بہت سے سائنس دانوں نے اس کا برا مانا، اور اس پر سخت تنقید کی۔ پروفیسر عبدالقدیر سلیم نے اس کتاب کے مصنف کا نقطہ نظر بھی پیش کیا ہے اور اس کا محاکمہ بھی۔ پیش نظر مقالہ عہد جدید کی تفہیم کی کوشش کی پہلی قسط ہے۔

سائنس کیا ہے۔

"بیسویں صدی سائنس کی صدی تھی۔ اور اکیسویں صدی میں داخل ہونے کے لیے ہمیں سائنس اور فنیات کی ایک مضبوط اساس کی ضرورت ہوگی"۔ "سائنس ہی آج انسان کو جہالت اور تعصبات کے اندھیروں سے نکال سکتی ہے"۔ "سائنسی فکر، معروضی ہوتی ہے، جب کہ مذہب، توہمات، تنگ نظری اور خلاف ارتقا۔۔ رجعت۔۔ پس ماندگی اور وحشیانہ ماضی کی یادگار ہے"۔ مگر بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ بات یوں نہیں، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ سائنس اور مذہب میں کوئی تصادم ہی نہیں۔ ایک ترقی یافتہ مذہب، مثلاً اسلام، معروضی سائنسی حقائق کے خلاف اپنے دامن میں کچھ بھی نہیں رکھتا۔ سائنسی انکشافات اور نظریے، مذہب کی نفی نہیں کرتے، بلکہ انھیں ثابت کرتے ہیں۔ ایک ہاتھ میں مذہب اور دوسرے ہاتھ میں جدید سائنسی نظریہ لے کر ہی ہم آج ترقی کی منزلیں طے کر سکتے ہیں۔

انیسویں اور بیسویں صدی میں سائنس کی بے پناہ یلغار اور نہ رکنے والی فتوحات نے تاریخ

ثقافت، مذہب اور فنون کے عالموں کو ایک دفاعی رویے کو اپنانے پر مجبور کر دیا۔ بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں انسان نے ہوائی جہازوں کے ذریعے فضا میں پر پھیلائے تو ہندوستان کے بعض مذہبی دانش وروں نے کہا کہ یہ کون سی نئی بات ہے؟ ہمارے پرکھوں کے زمانے میں "اڑن کھٹولے" ایجاد ہو چکے تھے۔ مسلمان کیوں پیچھے رہتے، وہ قصص الانبیا سے حضرت سلیمان علیہ السلام کے تخت رواں کی کہانی لے آئے۔ بیسویں صدی کے وسط میں سیارچے خلا میں گردش کرنے لگے تو ابن عطا مقنع کے ہاتھوں "ماہ نخشب" کی داستان اور ہندوؤں کی روایتیں یاد دلائی گئیں۔ اس خود اعتقادی کی مشق میں برصغیر کے ہندو اور مسلمان ہی نہیں، کم و بیش ساری دنیا کے لوگ شریک تھے۔ ان میں عامی بھی تھے اور علما بھی۔

سوال یہ ہے کہ سائنس ہے کیا؟ کہا گیا کہ سائنس نام ہے معروضی علم کا۔ ایسا معروضی علم، جو کسی وحی، الہام، کشف، وجدان یا ادھر ادھر کی روایات اور خرافات پر مبنی نہ ہو، بلکہ اس کی اساس مشاہدے اور تجربے پر ہو۔ مشاہدہ جو معروضی ہو، اور ہر شخص اس سے گزر کر اس کی تصدیق کر سکے۔ تجربہ، جو بار بار دہرایا جا سکے، اور انھی نتائج تک لے جائے جنھیں سب پرکھ سکیں۔ علم کے دوسرے ذرائع موضوعی قرار دے کر یا تو رد کر دیے گئے، یا انھیں وقت گزاری یا تفریح کے لیے ایک دلچسپ مشغلے کی حیثیت دے دی گئی۔ ان میں فلسفہ، ادب عالیہ، مذہب اور صوفیانہ تجربات، سب شامل تھے۔ خاص طور پر فلسفے کی دنیا میں، جو وحی و الہام کے بعد فکر انسانی کی اعلیٰ ترین پرواز کا مظہر تھا، سائنس کے مقابلے میں وہ احساس کمتری پیدا ہوا کہ منطقی ایجابیت (logical positivism)، جدلی مادیت (dialectical materialism) سائنسی مادیت (scientific materialism) جیسے مدارس وجود میں آئے، جنھوں نے فلسفہ کو سائنس کی باندی بنا دیا۔ دوسری طرف بعض "فلسفیوں" نے بتایا کہ فلسفے کے روایتی مباحث ہیں ہی بے سود، اور فلسفے کا کام تو بس یہ ہے / ہونا چاہیے کہ وہ زبان اور الفاظ کے تحلیل و تجزیے تک خود کو محدود رکھے، اور "مابعد الطبیعیات" کی خیالی دیومالا سے خود کو آزاد کرے۔

"سائنس" کی بڑھتی ہوئی خود اعتادی اور فتوحات نے اسے عالم مادی اور اس کے مظاہر تک محدود نہیں رکھا۔ اس کی یلغار میں ادب بھی آ گیا اور فنون بھی، مذہب بھی آ گیا اور نفس و اجتماع انسانی بھی۔ کہا گیا کہ مذہب، ثقافت اور فن اپنے عہد کے معروضی مادی حقائق کی پیداوار ہوتے ہیں۔ ان مادی حقائق میں زمین، دریا اور سمندر، موسم، کھیت، اناج اور زمین کی دوسری پیداوار اور نسلی خصوصیات شامل ہیں اور یہ نسلی خصوصیات بھی کیا ہیں؟ یہ انھی ارضی و (سماوی) معروضی حقائق سے ظہور پذیر ہوتی ہیں: ایک افریقی کا سیاہ رنگ اور گھونگریالے بال اور ایک اسکنڈی نیویائی کی سفید جلد اور بلانڈ زلفیں جوان کے مختلف النسل ہونے کی چغلی کھاتی ہیں، انھی معروضی ارضی حقائق کی پیداوار ہیں۔ تمام

رسم و رواج، کلچر، ثقافت اور مذہب انھی ارضی گروہی رشتوں میں تحویل پذیر ہیں۔ انسانی وجود کی داستان، دراصل اس ایک خلوی "حیوان" کی کہانی ہے، جو اربوں سال قدیم سمندروں میں کاربن کے نامیاتی اجزا کے ان گنت اور بے مقصد تال میل سے آخرکار وجود میں آگیا تھا۔ اس کے پیچھے نہ کوئی مقصد تھا، اور نہ اس کے ذریعے وجود میں آنے والے شاہ کار۔۔ انسان۔۔ کے آگے کوئی غایت ہے۔ ظہورِ حیات اور نسلِ انسانی کا فروغ، کائنات کی تاریخ کی ایک دلچسپ مگر بے معنی سطر ہے، جس کا لکھنے والا مفقود ہے، کیوں کہ وہ نہیں ہے۔

انسانی تاریخ اور ہیئت اجتماعی کی تفہیم اگر کرۂ ارض کے بروبحر کے معروضی حالات سے ہو سکتی ہے (وائکنگ اور ان کی اولاد کیوں جری، جنگ جُو جہاز راں بن گئے اور آسٹریلیا کے قدیم باشندے کیوں ٹھٹھر کر رہ گئے؟) تو فرد کے رویے اور کردار کو اس کی جینیاتی ساخت کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کی نفسیات کے وظائف کی تفہیم اس کی عضویات اور جسمانی کیمیا کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ کیمیا کو طبیعیات کی اصطلاحات میں تحویل کیا جا سکتا ہے، اور طبیعیات مادے کی کیمیائی تشکیل کے ذریعے قابل فہم ہے۔ اس سے ماورا کوئی اور حقیقت نہیں۔

سائنس اور معروضی فکر

یہ وہ فکری موسم ہے جس میں آج کی غالب تہذیب پروان چڑھی ہے۔ اور چونکہ یہ غالب تہذیب ہے، اس لیے اس کے اثر سے مشرق اور مغرب میں کم ہی لوگ پاک رہ سکے ہیں۔ عامی اور عالم، اہلِ دین اور اہلِ دانش، سبھی "معروضی حقائق" اور "سائنسی صداقتوں" کی بات کرتے ہیں، اور اقدار، مذہب اور اخلاقیات کو بھی انھی اصطلاحات میں بیان کرنے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر کیا صورت حال فی الواقع یہی ہے؟ سائنس جو کہ ایک ہیئتِ حاکمہ (Establishment) کی صورت اختیار کر چکی ہے، نسل انسانی کو کہاں لے جا رہی ہے؟ جنتِ ارضی کی طرف جہاں بھوک، احتیاج، مرض اور اذیت ایک قصہ ماضی بن کر رہ جائیں گے یا اس تباہی کی طرف جس کا ایک چھوٹا سا نمونہ ۱۹۴۵ میں ہیروشیما کے باشندوں نے دیکھا، لیکن بہت سے بیان کرنے کے لیے باقی نہ بچے۔ یا ۱۹۹۰ کی خلیج کی جنگ میں جب لوگوں نے "باشعور" میزائلوں کو اپنے اہداف کی طرف پرواز کرتے، تیل کے سیکڑوں کنوؤں کو سلگتے، ہزاروں مربع میل کے سمندروں کو تیل سے آلودہ اور لاکھوں مربع میل کی فضاؤں کو زہریلے دھوؤں سے تاریک ہوتے ہوئے دیکھا۔ ایک ایسی دنیا، جس میں ہر منٹ میں ہزاروں مربع میل جنگل کاٹ

دیے جا رہے ہیں، اور سمندروں میں یوں ماہی گیری کی جا رہی ہے کہ وہ مچھلیوں سے "پاک" ہوتا جا رہا ہے۔ اوزون (ozone) کی سقف میں سوراخ ہو چکا ہے، تپ دق جیسی بیماریاں ایک بار پھر زیادہ توانا جراثیم کے جلو میں لوٹ کر آ رہی ہیں، اور ایڈز اور سرطان کے نئے عفریت نسل انسانی کو شکار کرنے میں مسابقت کر رہے ہیں۔ یہ نئی دنیا کی ایک جھلک ہے۔ تو کیا سائنس کوئی شیطانی علم ہے؟ کیا اسے مدارس اور جامعات سے خارج کر دینا چاہیے؟ کیا تمام سائنسی تحقیقات کے اداروں کو مقفل کر دیا جائے اور ان کے کتب خانوں کو نذر آتش کر دیا جائے کہ انسان اس خود ساختہ عفریت کے چنگل سے نجات پا سکے، جو آہستہ آہستہ مگر استقلال کے ساتھ پوری نسل انسانی کو تباہی کے غار کی طرف دھکیلتا جا رہا ہے؟

شاید سائنس کا کوئی بھی معقول ناقد ان سوالوں کا جواب اثبات میں نہیں دے گا، اور نہ یہ میرا منشا ہے کہ سوالات کو یوں لیا جائے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کا جواب ہاں بھی ہے، اور نہیں بھی۔

برطانوی مفکر اور کالم نگار، اے پل یارڈ نے اپنی فکر انگیز کتاب "عہد حاضر کی تفہیم" (Understanding the Present) میں اسے خوبصورتی کے ساتھ یوں بیان کیا ہے: "اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب کچھ اس چیز کو ہدف بناتی ہے، جسے "سائنس" کہا جاتا ہے، اور یہ "چیز" ظاہر ہے کہ اس کا ظہور بڑے بڑے اداروں اور بنیادی طور پر جامعات ہی میں نظر آتا ہے۔ اس پوری کتاب کے دوران میں خوشی خوشی جو بات مان کر چلا ہوں اس سے ان اداروں سے وابستہ بیشتر افراد میرے ساتھ اتفاق ہی کریں گے۔ کیوں کہ جو بات میں کہنے جا رہا ہوں، وہ بس اتنی ہی تو ہے کہ سائنس، کسی بھی دوسرے انسانی علم کی بہ نسبت، زیادہ کامیاب اور موثر ثابت ہوئی ہے، اور اس بنا پر وہ ہمارے طرز حیات، ہماری دنیا اور دوسرے لوگوں کے لیے ہمارے رویوں کو متعین کرنے والی بنیادی قوت بن گئی ہے۔ اور یہ بات خطرناک ہے، کیوں کہ سائنس کی کوئی اخلاقیات یا ایمان نہیں ہے، اور وہ ہمیں ہماری اپنی حیات کے معنی، مقصد اور اہمیت کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتاتی۔ لیکن پریشانی کی بات یہ ہے کہ لوگوں کو یہ باور کرا دیا جاتا ہے کہ سائنس کی قیاسی کارکردگی یہ ثابت کرتی ہے کہ وہ یہ سب چیزیں مہیا کر سکتی ہے۔ لوگوں میں اس غلط خیال کو مستحکم کرنے میں سائنسی لٹریچر پیدا کرنے والوں کا بڑا ہاتھ ہے، جو عموماً ناقص، بلند آہنگ اور اکثر غلط سلط مقبول عام سائنسی ادب لکھتے رہتے ہیں۔ تو ضرورت اس بات کی ہے کہ سائنس کو واپس کھینچ کر ثقافت و تہذیب کے دائرے میں لایا جائے تاکہ اس کے بدترین استعمالات اور بھیانک دعووں کو لگام دی جا سکے۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ لوگ اچھی سائنس اور حقیقی سائنس کو سمجھنے لگیں، اسے استعمال کریں، اور اس کے ساتھ مکالمہ کریں، نہ کہ سائنس انھیں استعمال کرے اور ان کی دست گیر و سرپرست بن جائے۔ (ص xii)

اے پل یارڈ سے اگر کوئی اختلاف کیا جا سکتا ہے تو وہ اس کا یہ بیان ہے کہ سائنس کی کوئی اخلاقیات اور ایمان نہیں ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انیسویں اور بیسویں صدی کی سائنس کا ایک نظام ایمان و عقائد بھی ہے، اور، جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے، ایک نظام اخلاق بھی۔ اس طرح سائنس، مذہب کی رقیب بن کر ابھری، جو انسان کے عقائد، ایمانیات، کردار اور زندگی کے رخ کو متعین کرنے میں اہم ترین عامل رہا ہے۔ ان معنوں میں سائنس محض ایک بے رنگ و بے کیف معروضی معلومات کا مجموعہ نہیں، بلکہ ایک انسان ساز ادارہ بن گئی ہے۔ یعنی اس نے خود ایک مذہب کا روپ دھار لیا ہے، جس کی اپنی عبادت گاہیں اور یاترائیں ہیں، مہنت اور پجاری ہیں، رسوم اور عبادتیں ہیں، نظام خراج و خیرات ہے، اپنی ایک برادری ہے، جس کے مفادات کا تحفظ سب کی مشترکہ ذمہ داری ہے، اور اس طرح یہ ایک اسٹیبلشمنٹ ہے، جو بیرونی مداخلت کی مزاحمت کرتا ہے اور اس کے خلاف لڑنے کے لیے آمادہ رہتا ہے۔ اور یہی بات تشویش ناک ہے۔ آگے چل کر اے پل یارڈ خود بھی اس کا اعتراف کرتا ہے۔ آیئے اس ضمن میں اس کی بات بھی سنیں۔

سائنس کا دعویٰ

ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم اور بیسویں صدی کے وسط کے دانشور سیاست دان، جواہر لال نہرو نے کہا تھا: "مستقبل، سائنس کا ہے، اور ان لوگوں کا، جو سائنس کو دوست بنا لیں"۔ نہرو کی یہ سوچ ایک پس ماندہ ملک کے بیرونی مغربی اداروں کے تعلیم یافتہ ایک سیاسی قائد ہی کی فکر نہیں تھی، بلکہ اب بھی تیسری دنیا کے بیشتر خواندہ، نیم خواندہ اور اہل دانش یوں ہی سوچ رہے ہیں۔ اور اس سوچ کو پروان چڑھانے میں انیسویں صدی کی مادیت ہی کا ہاتھ نہیں، بلکہ نئی معتبر سائنسی مقتدرہ بھی اسی فکر کو فروغ دے رہی ہے۔ فلسفہ مادیت، جس کے بطن سے نئی سائنس پیدا ہوئی، یہ دعویٰ لے کر اٹھا کہ مجھے روز ازل میں کائنات میں مادے اور توانائی کی کل مقدار، اور ان کی حرکیات و تعامل کے قوانین بتا دو، تو میں تمھیں پوری کائنات کی تاریخ اور اس کے چھوٹے سے چھوٹے ذرے کی سوانح اور انجام کی خبر دے دوں گا۔ یہی زعم اور دعویٰ ہمارے عصری سائنس دان اسٹیفن ہاکنگ کا ہے۔ "ایک مختصر تاریخ زماں" (A brief history of Time) میں وہ فرماتے ہیں کہ آخر کار ہم ایک ایسے کامل نظریے تک پہنچ جائیں گے جس کی مدد سے ریاضی کی کچھ مساوات (equations) کے ذریعے ہمیں ماضی، حال اور مستقبل کو دریافت کر لینا ممکن ہو جائے گا۔ "وجود کا کھیل کیوں کر کھیلا جاتا ہے، اس کے کیا قوانین ہیں،

کائنات کیسے وجود میں آئی، اس کی موجودہ کیفیت کیا ہے اور اس کا انجام کیا ہو گا، یہ سب باتیں الم نشرح ہو جائیں گی اور یہ طبیعیات کی انتہا ہو گی۔ اگرچہ ریاضی کے پیچیدہ مساوات اور گنجلک قوانین ہر عامی کی فہم سے بالاتر ہوں گے، اور سائنس کے منت ہی ان علوم اور ان کے اطلاقات کے جان کار ہوں گے، لیکن عمومی انداز میں یہ نظریہ اور اس کے نتائج ایک عام انسان کے لیے اس طرح قابل فہم ہوں گے، جس طرح آج نیوٹن کے قوانین یا آئن شائن کا نظریہ اضافیت ہر اسکول کے بچے کے دام آگاہی میں آگئے ہیں۔ یہ قوانین جدید دنیا کے کلچر کا حصہ بن جائیں گے، اور پھر ہم سب۔ سائنس دان، فلسفی، اور عامی۔ اس پر بحث کر سکیں گے کہ ہم اور یہ کائنات کیوں وجود میں آگئے۔ اور اگر ایسا ہو گیا (اور کوئی وجہ نہیں کہ ایسا نہ ہو سکے) تو یہ فکر انسانی کی معراج ہو گی۔۔۔ ہم خدا کے ذہن میں جھانک کر دیکھ سکیں گے"۔ (ہاکنگ : ص ۱۷۵)

آپ کیا کہیں گے : كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ۔ "ایک بڑا بول ہے جو وہ بول رہے ہیں"۔ (الکہف ۱۸:۵) مگر جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں، یہ سائنس کا کوئی نیا دعویٰ نہیں۔ کارل ساگاں (Carl Sagan) نے سائنسی نظریات کو مقبول عام بنانے میں شہرت پائی، ہاکنگ کی کتاب کے تعارف میں کہتے ہیں : "یہ کتاب خدا کے وجود کے بارے میں بھی ہے .... یا شاید خدا کے عدم وجود کے بارے میں"۔ (ہاکنگ، ص ۱۰)

بہرحال جہاں کائنات کی بات آئے گی، وہاں یہ سوال بھی پیدا ہو گا کہ آیا اس کائنات کا کوئی خالق بھی ہے یا نہیں۔ دنیا کے تمام مذاہب اس کا جواب اثبات میں دیتے ہیں۔ سائنس نے اس کا جواب کس طرح دیا۔ اس میں آج کے علما کا اختلاف ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ جوں جوں انسان کے علم کا دائرہ وسیع ہو تا جا رہا ہے، اور وہ فطرت اور کائنات کے چہرے سے نقاب اٹھا رہا ہے، اسے خالق کی حکمت کے واضح ثبوت ملتے جاتے ہیں، اور وہ یہ پکارنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ، "(اے اللہ) تیری ذات پاک ہے، تو نے اسے باطل (جھوٹ) کے طور پر نہیں پیدا کیا..." مگر بعض دوسرے یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ یہ تعقل اور دیے ہوئے قضایا سے اس طرح نتائج اخذ کرنا سائنس کا کام نہیں۔ سائنس، اپنی فطرت میں استخراجی (deductive) نہیں، بلکہ استقرائی (inductive) ہے۔ اس کا کام شواہد اور معلومات کو جمع کرنا اور ان کی بنیاد پر ایک عمومی قضیے کی تشکیل ہے : سطح سمندر پر ہوا کے ایک مخصوص دباؤ پر جب بھی پانی کے نقطہ ابال کو دیکھا گیا، یہ پتہ چلا کہ ۱۰۰ درجے سینٹی گریڈ ہے۔ اس لیے پانی ہمیشہ ان حالات میں ہمیشہ اسی درجہ حرارت پر ابلے گا۔ جان دار اور بے جان اشیا کے بارے میں اس طرح کی تعمیم کا نام سائنس ہے۔ اب اس میں خدا کا کیا ذکر؟

سائنس اور کارکردگی

جیکب بروناؤسکی (Jacob Bronowski) نے خیال ظاہر کیا کہ سائنس اور فنیات (technology) مخصوص اور خالص انسانی وظائف ہیں، اور یہی انسان کو وحشی حیوان سے متمیز کرتے ہیں۔ وہ بیل گاڑی کا پہیہ ہو یا ہل، نظریہ اضافیت ہو یا مائیکرو ویو، ان کی اصل اور سرچشمہ ایک ہی ہے۔ انسان کی سوچ اور اختراع کی قوت اور اسی قوت نے آج اس دنیا کی تشکیل کی ہے، جس کے بغیر ہم آج زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ کسی بھی عامی یا طالب علم سے پوچھیے کہ سائنس کیا ہے؟ اور وہ آپ کو بتائے گا کہ وہ بجلی، جو آپ کے کمرے کو روشن اور خنک بنائے ہوئے ہے، تار برقی اور لاسلکی، جس کی مدد سے آپ دور دراز کی آوازیں اور عکس دیکھ لیتے ہیں، ہوائی جہاز، جن کی مدد سے آپ مہینوں کے سفر ہوا کے دوش پر چند گھنٹوں میں کر لیتے ہیں، یہ سب سائنس ہی کی برکتیں ہیں۔ سائنس اگر نظریات کا نام ہے، تو ان کے اطلاق کا نام فنیات (ٹیکنالوجی) ہے، جو آپ کے لیے ٹیلی فون، ریڈیو، ٹی وی، کاریں، بلند و بالا عمارتیں، حیرت انگیز ذرائع رسل و رسائل مہیا کرتی ہے۔ سائنس کے بغیر آپ کا یہ لباس، غذا، تفریح، تعلیم اور علاج ممکن نہ ہوں گے۔

اے پل یارڈ کا کہنا ہے کہ سائنس کی یہی وہ جادو کی چھڑی ہے، جس سے آج انسان کو ہانکا جا رہا ہے۔ سائنس جو کچھ بھی ہو یا نہ ہو، آج اس کے بغیر زندگی ممکن نہیں۔۔۔ پین سلین کے بغیر بہت سی بیماریوں کا علاج ہی نہیں ہو سکتا، ہوائی جہاز ہمیں آغوش میں لے کر پرواز کرتے ہیں، نئی مصنوعی کھاد سے بھرپور فصلیں حاصل ہوتی ہیں، وغیرہ۔ ہماری تو فقط باتیں ہیں سائنس کام کرتی ہے! "پادری صاحب مساکین کو تلقین کرتے ہیں کہ اپنی قسمت کی سختیوں کو صبر و شکر سے جھیل لیں، سیاست دان انھیں بغاوت پر آمادہ کرتا ہے، لیکن ایک سائنس دان ایسا طریقہ ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے کہ ان کی بدقسمتی کا خاتمہ ہو جائے"۔ سالماتی حیاتیات کے عالم میکس پیروٹز کا یہ خیال کوئی انوکھا خیال نہیں: "سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ کچھ چیزیں ہیں، جنھیں "مسائل" کہا جاتا ہے۔ اور ان سے متعلق کچھ چیزیں ہیں جنھیں "حل" کہا جاتا ہے۔ اور "سائنس" یہ بتاتی ہے کہ وہ "حل" کیا ہیں۔ آپ اپنے گھر میں موسیقی کی کیفیت اور سہولت سے مطمئن نہیں؟ یہ لیجیے، کمپیکٹ ڈسک پلیئر حاضر ہے۔ آپ چیچک سے بچنا چاہتے ہیں؟ یہ انجکشن لے لیجیے۔ آپ چاند پر جانا چاہتے ہیں؟ یہ رہا راکٹ۔ آپ بھوک کا شکار ہیں؟ ہم بتاتے ہیں کہ زیادہ اناج کیسے اگایا جائے۔ آپ بہت موٹے ہو گئے ہیں؟ یہ طریقہ ہے وزن کم کرنے کا۔ آپ

ٹھیک نہیں محسوس کر رہے؟ یہ گولی لے لیجیے، اور اپنا موڈ ٹھیک کر لیجیے۔ کوئی مسئلہ نہیں۔ یہ ہے سائنس۔

تاریخ سائنس لکھنے والوں نے ہمیشہ یہی کہا ہے کہ پہیے کی ایجاد سے لے کر کمپیکٹ ڈسک اور کمپیوٹر تک سائنس کی تمام فتوحات ایک ہی کہانی کے ابواب ہیں۔ ارشمیدس اور ابن الهیثم، ایڈیسن اور آئن سٹائن، نیوٹن اور ڈارون ایک ہی خانوادے کے اراکین ہیں۔ اے پل یارڈ اس قضیے سے قطعیت کے ساتھ انکار کرتے ہیں۔ ایک ہل اور سی۔ ڈی پلیئر یا ٹی وی میں محض یہی فرق نہیں کہ ایک قدیم ایجاد ہے اور ایک نئی۔ دونوں میں اساسی اور جوہری فرق ہے۔ دونوں کے خالق کا طریق علم ہی مختلف ہے۔ کیوں؟ اس کا جواب آگے آئے گا۔ مگر پہلے سائنس کے ایک اور پہلو پر غور کیجیے: سائنس کا یہ اعتماد کہ وہ ہر چیز جان سکتی ہے، ہر چیز کر سکتی ہے، اگر ابھی نہیں، تو آئندہ بس ذرا صبر کیجیے۔

اے پل یارڈ، دنیا کے نئے اور پرانے نقشوں کی مثال سے اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہیں۔ پرانے زمانے میں نقشہ کشی کا علم اور فن تقریباً کلی طور پر ان سیاحوں کا مرہون منت تھا، جو ان زمینوں۔۔۔ براعظموں، دریاؤں اور سمندروں میں سفر کر چکے تھے۔ اپنے سفر اور تجربات کے حوالے سے انھوں نے یہ نقشے ترتیب دیے۔ مگر ان معلوم خطوں اور سمندروں سے آگے کیا ہے؟ نامعلوم دنیا، جن میں عفریت نما حیوان، دیو اور پریاں بستی ہیں۔ علم نقشہ کشی کچھ آگے بڑھا۔ معلوم افریقہ کو وہ نقشہ پر لے آئے، اور باقی کو "تاریک براعظم" کہہ دیا۔ یہ بھی نامعلوم کے لیے ایک اور اصطلاح تھی۔ مگر نقشہ کشی کی نئی تکنیک کے ذریعہ، جس میں مشاہدے اور تجربے کے ساتھ مساحت اور ٹرگنومیٹری، طول البلد اور عرض البلد کے ذریعے ہم بہتر نقشے تیار کر سکتے ہیں، ہم دنیا کی ایک "زیادہ کار آمد" تصویر بنا سکتے ہیں۔

"کار آمد" ایک اہم تصور ہے۔ آپ کرہ ارض پر جہاں بھی ہوں، ایک "کار آمد" نقشہ، قطب نما اور جدید علم آپ کو بتا دے گا کہ زمین پر آپ کا محل کیا ہے، آپ کہاں کھڑے ہیں، اور جہاں جانا چاہتے ہیں اس کے لیے آپ کو کس طرف سفر کرنا ہو گا۔ یہ ایک نیا علم ہے۔ جدید انسان، پرانے زمانے کے لوگوں سے مختلف ہے، جو محض اپنی چھٹی حس یا ستاروں کی مدد سے سفر کرتے تھے۔ دنیا اب عرض البلد اور طول البلد کے جال میں جکڑی جا چکی ہے۔ ٹیلی مواصلات، ریڈیو، مائیکروویو کے تانے بانے انسان کو گم ہو جانے سے بچانے کے لیے کافی ہیں۔

گویا سائنس ایک کار آمد علم اور موثر قوت کا نام ہے۔ سائنس ہمیں ہر چیز بتا سکتی ہے۔ ہمارے لیے سب کچھ کر سکتی ہے۔ اگر آج نہیں، تو کل وہ ایسا کر سکے گی۔ بس وقت کی بات ہے۔ سائنس نے ہمارے اندر یہ "زبردست خود اعتمادی پیدا کر دی ہے کہ اس کے ذریعے ہم سب کچھ جان سکتے ہیں، اور سب کچھ کر سکتے ہیں۔ سائنس الہ دین کے چراغ کا جن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گو ہم میں سے بہت سے مغرب

اور مغربی تمدن کو پسند نہیں کرتے، لیکن مغرب سے درآمد نئی سائنس کے بغیر گزارے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ پیداوار بڑھانی ہو یا کسی بیماری اور وبا پر قابو پانا ہو، آب رسانی اور بجلی کی ترسیل کا معاملہ ہو یا پیمانہ کبیر پر انسانوں کو ہلاک کرنے اور ان کی بستیوں کو برباد کرنے کا مسئلہ، ہم ان سب کے لیے مغرب ہی کی طرف دیکھتے ہیں۔ کھانے پینے، راحت و آرام اور جنگ و جدال کے لیے ہمیں مغرب سے درآمد سائنس کی ضرورت ہے۔ مغرب کتنا ہی مبغوض اور مردود ہو، کتنا ہی قابل نفرین ہو، ہم اسے اور اس کی تہذیب و کلچر کو اپنے لیے زہر قاتل سمجھتے ہوں، اور بحیثیت مجموعی مغرب کے پورے نظام کو اپنا دشمن سمجھتے ہوں، لیکن اس کی سائنس اور فنیات کو حاصل کرنے کے لیے ہم ہر قربانی دینے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ہم اس کے لیے کسی بھی حد تک جانے کو تیار ہیں۔ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ مغرب کا مقابلہ ہم مغربی سائنس اور ٹیکنالوجی ہی سے کر سکتے ہیں! کیا صورت حال واقعی یہی ہے؟

اقدار کا مسئلہ

اس فکر کی پشت پر یہ خیال عام ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی، کوئی اقداری رنگ نہیں رکھتیں۔ دوسرے الفاظ میں اقدار کے سلسلے میں یہ غیر جانبدار اور بے رنگ ہیں۔ سائنس "کیا ہے؟" کا جواب تو دے دیتی ہے، اور ٹیکنالوجی بتا دیتی ہے کہ کوئی مقصد "کس طرح" حاصل کیا جا سکتا ہے" مگر یہ دونوں "کیا ہونا چاہیے" کا جواب نہیں دیتیں۔ یہ فیصلہ تو آپ کو خود کرنا چاہیے۔ اور یہ فیصلہ تو آپ خود کرتے ہیں نا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ اے یل یارڈ ایک دل چسپ مثال دیتے ہیں۔ فرض کیجیے دنیا کے کسی دور افتادہ الگ تھلگ مقام پر ایک بچہ بیمار ہے۔ پین سلین سے وہ ٹھیک ہو سکتا ہے، ورنہ وہ مر جائے گا۔ ایک مغربی طبیب اسے پین سلین دیتا ہے، اور وہ شفایاب ہو جاتا ہے۔ اس علاقے کے لوگ اس جادو اثر دوا کے قائل ہو جاتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ یہ اور اس جیسی دوسری طلسماتی دواؤں کی زیادہ مقدار حاصل کریں۔ لیکن اس کے لیے انھیں مغرب سے مبادلہ اور تجارت کے رشتے استوار کرنے ہوں گے۔ یہ تجارت انھیں "ترقی یافتہ" دنیا کے ساتھ معاشی اور دوسرے تعلقات کے بندھنوں میں لے آئے گی۔ یہ ایک عالم گیر عمل ہے، اور ایک دفعہ یہ شروع ہو جائے، تو پھر پہیے کو الٹا نہیں گھمایا جا سکتا۔ پین سلین کے ساتھ معالجے کے دوسرے طریقے، بجلی، کولڈ اسٹوریج، مواصلات، رسل و رسائل، ذرائع اطلاع و ابلاغ اور پھر دوسری ثقافتی اور سماجی اقدار بھی آئیں گی۔ انھیں کس طرح روکا جا سکتا ہے؟

اس طرح اگر ہم مغرب کی جدید طبی دریافتوں اور معالجے کے نئے طریقوں کو اختیار کرتے ہیں، تو

ہم مغرب کے ثقافتی اور سماجی نظام کو بھی اختیار کرتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ایک نیا نظام اقدار بھی ساتھ چلا آتا ہے۔ اے پل یارڈ کہتے ہیں کہ سائنس زندگی کے مسئلہ کو اخلاق کے دائرے سے نکال کر امکان کے دائرے میں لے آتی ہے (ہم یہ کر سکتے ہیں، وہ کر سکتے ہیں) گویا ہم عالم مثال سے عالم امکان میں آجاتے ہیں۔ مگر شاید زیادہ موزوں بات یہ ہوگی کہ سائنس، قدیم نظام اقدار کو توڑ پھوڑ کر اسے اپنی ایجادات اور اختراعات کے جلو میں لے کر آتی ہے۔ سائنس کوئی بے زبان اور مطیع خادمہ نہیں، بلکہ ایک ایسا جن ہے جو اپنی "خدمت" کا پورا پورا معاوضہ وصول کرنا خوب جانتا ہے۔ وہ لوگ جو مغرب کی محض مادی قوت کے حصول اور اس کے سماجی اخلاقی نظام کو "فلٹر آؤٹ" کرنے کا سوچتے ہیں، حقیقتاً وہ احمقوں کی دنیا میں رہتے ہیں۔ [سائنس] ..... روحانیت کو مٹا دینے والی قوت ہے، وہ پرانے اہل اختیار اور روایتوں کو جلا کر بھسم کر ڈالتی ہے۔ اس نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ کسی اور کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ سائنس دان، جلد یا بہ دیر، لازماً ساحروں، جادوگروں اور کاہنوں کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں۔ ان کے جادو اثر معالجے، ہمارے لیے طلسمات کا درجہ رکھتے ہیں، ان کے تجربات ہماری پوجا بن جاتے ہیں"۔ (ص ۹)

مغرب کا ذہن جس سائنسی علمیات کے سائے میں پروان چڑھا ہے، اس کی ایک اور صفت فکری آزاد روی ہے۔ مغرب کے "لبرل ازم" نے بظاہر تو رواداری کو فروغ دیا، اور "تمہارے لیے تمہارا دین ہے، اور میرے لیے میرا دین" کے سنہرے اصول کو اپنا راہنما اصول بنایا، لیکن دراصل اس کے پیچھے "کثرتیت" (pluralism) کی سوچ کار فرما تھی۔ صداقت کوئی تلی بندھی چیز نہیں، سچائی، اپنے زماں و مکاں کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے۔ کوئی اصول غیر متغیر نہیں۔ کوئی اٹل حقیقت نہیں۔ جو آج درست ہے، کل نہ ہوگا۔ "خوب و ناخوب عمل کی ہو گرہ وا کیوں کر؟" اس کے لیے یہ دیکھیے کہ مال و نتائج کے اعتبار سے کیا مفید ہے۔ جو مفید ہے، کار آمد ہے، وہی خوب ہے۔ جو ایسا نہیں، ناخوب ہے! اے پل یارڈ کہتے ہیں کہ "سائنس کوئی صداقت، کوئی رہنما روشنی، کوئی راستہ ہمارے سامنے پیش نہیں کرتی، وہ فرد کو اس دنیا میں اپنے مقام اور مقصد کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتا سکتی ..." (ص ۱۴)

یہ خیال ایک لحاظ سے غلط ہے، اور ایک جہت سے صحیح بھی۔ غلط ان معنوں میں کہ، جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں، سائنسی کلچر اسی کو درست اور خوب بتلاتا ہے جو کار آمد ہو اور جس سے کام نکل سکے۔ ان معنوں میں وہ ایک رہنما اصول دیتی ہے۔ تاہم اے پل یارڈ کا دعویٰ ان معنوں میں درست ہے کہ سائنس کوئی حتمی اور قطعی صداقت اور غیر متغیر اصول سامنے نہیں رکھتی۔ وہ تو آپ کو ابن الوقت بنا دیتی ہے۔ جس میں فائدہ ہو، آپ اسی کو اختیار کر لیں۔

آزاد معاشرہ

سائنسی لبرل ازم اور "معاشرہ کثرتیت" (pluralistic society) جیسی اصطلاحات کے ذریعے باور یہ کرایا جاتا ہے کہ وہ معاشرہ جن کے قائدین کسی ایک عقیدے پر غیر متزلزل یقین رکھتے تھے، یا اپنے تابعین کو ایک "سیدھی راہ" پر چلانے کی کوشش کرتے رہے، اور دوسرے تمام نظام ہائے حیات کو مسترد کر کے کسی مخصوص نظام فکر و عمل ہی میں انسان کی نجات دیکھتے رہے، وہ ہمیشہ آمریت پر منتج ہوئے۔ ایسے معاشرے، اس فکر پر قائم ریاستیں، ہمیشہ ظلم کے فروغ کا باعث بنیں اور بالآخر تباہی پر منتج ہوئیں۔ کیا آپ کو اسٹالین کا روس اور ہٹلر کا نازی جرمنی یاد نہیں؟ لیکن یہ تو حال کی بات ہے۔ روشن خیالی اور لبرلزم کے موجودہ دور سے پہلے تقریباً سبھی معاشرے اسی عدم رواداری اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ظلم و ستم کا شکار تھے! اپنے مذہب، قومیت اور طرز حیات و اخلاق کے لیے لوگوں نے کیا کیا سختیاں نہ اٹھائیں، کیا کیا مصیبتیں نہ جھیلیں۔ ان اخلاقیات کی وجہ سے لاکھوں کروڑوں لوگ اپنے وطن سے نکالے گئے، تہ تیغ کر دیے گئے۔ مگر یہ اختلافات فطری ہیں۔ کیوں کہ لوگ نسلی طور پر افتاد طبع کے اعتبار سے اور عقائد میں، یک رنگ نہیں ہو سکتے۔ تو پھر کیا کیا جائے؟ رواداری۔ ہر ایک کو آزادی ہونی چاہیے کہ وہ جو جی چاہے کرے، بشرطیکہ اس سے کسی اور کا نقصان نہ ہو رہا ہو۔ "آپ کی چھڑی گھمانے کی آزادی وہاں ختم ہوتی ہے جہاں میری ناک شروع ہوتی ہے"۔ اسی طرح ایک مستحکم معاشرہ قائم ہو سکتا ہے۔ اس لیے لبرلزم کسی آدرش کے ساتھ غیر متزلزل وابستگی کو درست نہیں سمجھتا، کہ یہ جمہوریت اور کثرتیت کے خلاف ہے۔ سرونسٹن چرچل نے ۱۹۴۷ میں دارالعوام میں کہا تھا: "یہ کہا گیا ہے کہ جمہوریت بدترین طرز حکومت ہے، سوائے ان تمام دوسرے نظاموں کے، جو اب تک وقتاً فوقتاً آزمائے گئے ہیں"۔

تو یہ ہے سائنسی معاشرے کا دفاع، جس نے جمہوریت کو جنم دیا، جو آج کے سیاسی کلچر میں حرف آخر ہے۔ ایک ایسا نظام زندگی جس میں انسان آزاد ہے کہ وہ اپنے لیے جو چاہے منتخب کرے، اور جس راہ پر چاہے گامزن ہو۔ حکومت کا کام لوگوں کو روزی اور آرام دہ زندگی مہیا کرنا ہے، ان کی کسی بھی طرح کی اخلاقی اور روحانی تعلیم و تربیت، حکومت کے پروگرام اور ذمہ داریوں کے دائرے سے خارج ہے۔ حکومت کا وہ کردار جس میں وہ ایک مہربان باپ، شفیق استاد اور مرشد دانا کے روپ میں ظاہر ہوتی تھی، ایک فرسودہ بلکہ ناپسندیدہ کردار قرار پایا۔ انسانوں کو چھوڑ دیا گیا کہ وہ کھائیں پئیں، عیش کریں، اور خود پر، اور اپنے معاشرے پر نت نئے تجربے کرتے پھریں۔ مردوں کی باہمی شادیاں، خواتین کا آپس میں

جیون ساتھی بن جانا، منشیات اور "ذہن کو کشادہ کرنے والی ادویات" رحیمانہ مریض کشی، جنسیات پر نئے تجربے، بے ماں باپ کے بچے cloning، اپنی دادی جان کو جنم دینا، اور ایسے بہت سے تماشے ہیں جن میں افراد کو آزاد چھوڑ دیا گیا ہے، اور وہ حیران و پریشان ہیں کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا، اور رہ نمائی کہاں سے ملے؟ سائنس تو "ہر روز نیا طور نئی برق تجلی" کے شوق میں نئے ایڈونچر کر رہی ہے۔ ایٹمی ہتھیار کیا محض اس لیے ہیروشیما اور ناگاساکی پر استعمال نہ کیے گئے کہ ان کے جو دو الگ الگ ماڈل تیار ہوئے تھے، ان کے جیتے جاگتے مظاہروں کی ضرورت تھی کہ انسانی آبادی اور شہروں پر ان کے کیا اثرات ہوں گے۔ ورنہ صحرائے نوادا میں ایٹم بم کا تجربہ تو پہلے کیا ہی جا چکا تھا، لیکن اس نئے ہتھیار، نئے جنگی کھلونے کی حقیقی تباہ کاریوں کا اس سے اندازہ تو نہ ہو سکتا تھا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ جاپان تو پہلے ہی جنگ ہار چکا تھا۔ دوسری جنگ عظیم اپنے مغربی تھیٹر میں اختتام کو پہنچ چکی تھی، جاپان مسلسل پسپا ہو رہا تھا، اور اس کا سنجیدگی سے صلح کی میز پر آجانا چند دنوں کی بات تھی۔ اور یہ ذہن میں رہے کہ اس قیامت خیز تماشے کا فیصلہ کسی آمر، بادشاہ یا آیت اللہ نے نہیں، دنیا کی سب سے مستحکم جمہوریت کے آقاؤں نے کیا تھا، جس پر آج بھی انھیں کوئی شرمندگی نہیں۔ بلکہ وہ اس امر پر اصرار کرتے ہیں کہ یہ وسیع تباہی والے خطرناک ہتھیار کسی غیر ذمہ دار، ایڈونچر کی شائق قیادت کے ہاتھوں میں نہیں، بلکہ صرف ہمارے پاس ہونے چاہئیں۔

یہ سیاسی فکر اور فلسفہ اخلاق خلا میں نہیں پیدا ہو گیا۔ ان کے پیچھے ایک سائنسی فکر اور سائنسی منطق تھی۔ سائنسی منطق نے کائنات کو اندھی طبعی قوتوں کے کھیل کا میدان بتایا، جس کا ابتدا میں کوئی مقصد تھا، نہ مآل کار کوئی حکمت ہے۔ حیات کا ظہور، محض ایک خوش گوار (؟) حادثہ تھا، مگر ایسا حادثہ بھی نہیں، کہ دیے ہوئے طبعی قوانین کے تحت ایک معین وقت میں ایسا تو ہونا ہی چاہیے تھا؟ پھر تنازع للبقا اور "بقائے اصلح" کے "قوانین" کے تحت جو کامیاب ترین نوع حیوانی وجود میں آئی، اس میں کار فرما منطق بھی یہ تقاضا کرتی ہے کہ زیادہ باصلاحیت اور زیادہ طاقتور اقوام باقی رہیں، دوسری اقوام ان کے لیے جگہ خالی کر دیں۔ انسان، فی نفسہ کوئی قدر نہیں رکھتا نہ کائنات میں اس کا کوئی خاص مقام ہے۔ ذی حیات اور ذی شعور یہ مخلوق، چیزوں کو دیکھنے کا ایک مخصوص تناظر رکھتی ہے۔ اس تناظر کی تبدیلی سے حقیقت بھی بدل جائے گی، کیوں کہ حقیقت کوئی دھلی دھلائی اور بنی بنائی چیز نہیں، بلکہ یہ تو ایک متغیر عامل ہے۔ سائنس اس نتیجے پر کن راستوں سے پہنچی، اس کی نشان دہی اور بازیافت بھی ایک دلچسپ کہانی ہے۔

رسائل و مسائل

۱۔ ایک شخص ساری عمر گناہ کرتا رہے، حقوق اللہ اور حقوق العباد میں خیانت کا مرتکب رہے، مگر اپنی آخری عمر میں توبہ کرے، تو کیا اب بھی اسے معافی مل سکتی ہے؟ اسی طرح حقوق اللہ کا معاملہ ہے۔ ساری عمر نماز نہ پڑھی، زکوٰۃ ادا نہ کی، قرآن نہ سیکھا وغیرہ۔ ان کوتاہیوں کا ازالہ کیسے ممکن ہے؟

۲۔ کہا جاتا ہے کہ ہر گناہ کے بعد توبہ کی جائے خواہ ستر بار ضرورت پیش آئے۔ کیا یہ دین کے ساتھ مذاق نہ ہو گا کہ گناہ بھی کیے جا رہے ہیں اور ساتھ ہی توبہ بھی؟

۳۔ اگر کسی نے اپنے کسی دوست کا، اس کی غیر موجودگی میں ایسے الفاظ سے ذکر کیا جس سے اس کی عزت خراب ہوئی ہے، اور اس کے لیے یہ ممکن نہ ہو کہ اس سے جا کر معافی مانگ لے، تو اب وہ کیا کرے؟

۴۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ آخرت میں جزا و سزا کا انحصار سرتاسر خدا کے فضل پر منحصر ہے۔ اس میں انسان کے عمل کو کوئی عمل دخل نہیں۔ بہت ممکن ہے کہ ایک شخص ساری عمر نیک اعمال کرتا رہے مگر اللہ تعالیٰ اسے جہنم میں بھیج دے۔ اور کسی کو، اگرچہ وہ برے اعمال کا ہی مرتکب ہو، بہت ممکن ہے کہ اس کی کسی ایک نیکی کو پسند کر لینے کی وجہ سے جنت عطا فرما دے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ جزا و سزا کا براہِ راست تعلق انسان کے اعمال سے ہے۔ پہلا گروہ اپنی بات کی دلیل ایک روایت کے حوالے سے دیتا ہے جس میں ایک فاحشہ عورت کا ذکر ہے جو محض اس بنا پر جنت کی مستحق ہو گئی کہ اس نے ایک بار ایک پیاسے کتے کو پانی پلایا تھا۔ براہِ مہربانی اس کی وضاحت کر دیں۔

۱۔ جب تک آدمی موت کو آتا دیکھ نہ لے، توبہ کا دروازہ کھلا رہتا ہے۔ کیونکہ انسان کو اپنی موت کا وقت معلوم نہیں، اس لیے اس کے امتحان کا تقاضا یہی ہے کہ ایسا ہی ہو۔ یہی قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ توبہ کا ایک جزیہ بھی ہے کہ انسان حتی الوسع حقوق العباد اور حقوق اللہ میں کوتاہیوں کی تلافی کرے۔ لیکن ہر انسان بقدر استطاعت ہی مکلف ہے۔ حقوق العباد زیادہ اہم ہیں۔ کسی کا مال کھایا ہے تو واپس کرے، اگر کر سکے۔ کسی کو ایذا پہنچائی ہے تو معافی مانگے۔ اسی طرح نماز کی قضائے عمری پڑھ سکتا ہو تو شروع کر دے۔ حساب کرے جتنی زکوٰۃ نکال سکتا ہے نکالے۔ بس دو باتیں سامنے رکھے۔ تلافی کرنا توبہ کا

حصہ ہے، لیکن جتنی ممکن اور بس میں ہو۔ باقی کے لیے اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے سبیل پیدا کرے گا۔

۲- اگر آدمی جان بوجھ کر گناہ کرتا رہتا ہے، اور ہر بار توبہ کا سہارا لیتا ہے، تو یہ گناہ پر اصرار ہو گا، اور ایسا استغفار، میری رائے میں، قبول نہ ہو گا۔ لیکن نہ کرنے کے عزم کے باوجود پھر مبتلائے گناہ ہو جاتا ہے، تو حدیث کے مطابق معاف کیا جاتا رہے گا۔

۳- استغفار کرے، اس کا ذکر عزت سے کرے، خصوصاً جہاں عزت خراب کی ہے وہاں بحال کرے۔ ہر صورت میں جا کر اسے یہ بتانا کہ میں نے تمھاری عزت خراب کی ہے، مجھے معاف کر دو، لازم نہیں۔ حکمت ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ بعض صورتوں میں اس سے فتنہ و فساد بڑھ سکتا ہے۔

۴- نہ یہ بات صحیح ہے کہ آخرت میں جزا و سزا میں انسان کے عمل کا کوئی دخل نہیں، اور نہ یہ بات کہ سارا انحصار صرف اعمال پر ہے۔ پہلی بات کی تردید تو قرآن کی وہ بے شمار آیات کرتی ہیں جن میں جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ کا مضمون بیان ہوا ہے۔ دوسرے کی تردید وہ آیات کرتی ہیں جن میں مغفرت و رحمت کو ضروری بتایا گیا ہے۔ راہِ صواب، میری دانست میں، یہ ہے کہ انسان کو نیک اعمال کی کوشش میں لگا رہنا چاہیے، لیکن یہ جاننا چاہیے کہ وہ کتنے ہی نیک اعمال کرے، اللہ کے حقوق کما حقّہٗ ادا نہیں ہو سکتے۔ نیک اعمال کی توفیق بھی اللہ کی رحمت ہے، اور گناہوں کی مغفرت بھی اس کی رحمت۔ اس رحمت کی دستگیری کے بغیر وہ جنت میں نہ جائے گا۔ لیکن یہ رحمت اندھے کی ریوڑیوں کی طرح تقسیم نہ ہو گی۔ اس کی شرائط قرآن میں بیان ہوئی ہیں۔ ان کا خلاصہ ہے: ایمان اور اعمال صالحہ کا ارادہ اور ان کے لیے سعی۔

شادی اور دیگر تقریبات سے متعلق کچھ سوالات ہیں، مجھے امید ہے کہ آپ ان کا مفصل جواب قرآن و سنت کی روشنی میں دیں گے۔

۱ ایسی شادیوں میں شرکت جائز ہے جہاں مخلوط اجتماع ہو، موسیقی ہو اور فلم بنانے کا انتظام ہو۔

۲۔ شادیوں کی رسمیں ... مثلاً مہندی، نکاح کے بعد لڑکی والوں کی طرف سے کھانا کھلانا، رخصتی کے وقت لڑکی کے بھائیوں کا رونا، رخصتی کے بعد اگلے دن لڑکی کو لڑکے والوں کے گھر سے واپس لے آنا... کس حد تک قابلِ قبول ہیں؟ یا بالکل غلط ہیں؟۔

۳۔ ایسی شادیوں میں شرکت کرنی پڑتی ہے جن میں مندرجہ بالا گناہ ہوتے ہیں۔ لیکن شرکت نہ کرنے پر رشتہ داری ٹوٹنے کا ڈر ہوتا ہے۔ ہم ان سے کہاں تک بچ سکتے ہیں؟

پہلے آپ تین بنیادی باتیں سمجھ لیں۔

۱۔ مختلف لوگوں کی ثقافت میں جو مختلف رسوم ورواج ہوتے ہیں وہ فی نفسہٖ ناجائز نہیں کہے جا سکتے، اِلاّیہ کہ ان میں کوئی ایسی چیز ہو جو شریعت میں ممنوع ہو۔ مثلاً کسی کو ایذا پہنچے، کسی کو اس کی مرضی کے خلاف مال خرچ کرنے پر مجبور کیا جائے، اسراف و تبذیر ہو، تفاخر ہو، کفر و شرک پر مبنی ہو، یا کوئی دوسری معصیت ہو۔

۲۔ اگر ایک منکر سے روکنے سے دوسرا منکر پیدا ہوتا ہے، تو یہ دیکھنا ضروری ہو گا کہ دونوں میں سے کس کا ضرر زیادہ ہے۔ اس سے بچنے کو ترجیح دی جائے گی۔

۳۔ ہر معاملہ پر ناجائز یا جائز کا فتویٰ لگانے کی روش پسندیدہ نہیں۔ سلف، حلال اور حرام کے الفاظ استعمال کرنے سے سخت اجتناب کرتے تھے۔ بعض چیزیں ان کے نزدیک حرام ہی ہوتی تھیں، ان کے لیے بھی وہ مکروہ کا لفظ استعمال کرنا پسند کرتے تھے۔

اب میں مختصراً آپ کے سوالات کے بارہ میں یہ بتادوں کہ میری رائے میں کیا پسندیدہ ہے اور کیا ناپسندیدہ۔

۱۔ عورتوں اور مردوں کا مخلوط اجتماع اور موسیقی جیسی چیزوں سے شریعت میں منع کیا گیا ہے، اس لیے ان سے اجتناب کرنا چاہیے۔ فلم بنانا فی نفسہٖ منع نہیں، اِلاّیہ کہ اس کا موضوع یا مقصد ممنوع ہو، شادی کی ویڈیو میں جس طرح دلھن کو اور عورتوں کو دکھایا جاتا ہے، وہ صحیح نہیں۔

۲۔ شادی کی جن رسموں کا آپ نے ذکر کیا ہے، ان میں سے کسی کو میں ناجائز نہیں کہہ سکتا۔ مثلاً اگر لڑکی والے خوشی سے کھانا کھلا رہے ہیں، یا بھائیوں کا رونا فطری ہے، یا لڑکی کا اگلے دن اپنے گھر آنا معروف اور باہمی رضامندی سے ہے، تو ان میں کوئی قباحت نہیں۔ لیکن ان رسومات میں اگر مال اور وقت کا اسراف ہے، فخر و نمود ہے، رسوم کے اخراجات ایک بوجھ ہیں، تو ان سے اجتناب کرنا چاہیے۔ خصوصاً مہندی کی رسم نے جو حیثیت اور صورت اختیار کر لی ہے، وہ سخت ناپسندیدہ ہے۔

۳۔ اگر کوئی مجلس کلیتہً حرام نہ ہو، اور اس میں عدم شرکت سے قرابت کے تعلقات ٹوٹنے کا امکان ہو، تو آپ بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کون سا منکر بڑا ہے۔ اس ضمن میں آپ سیّد مودودی کی کتاب، رسائل و مسائل، ج ۱، ص ۱۴۳ بھی ملاحظہ کریں۔ واللہ اعلم بالصواب

ہم لوگ یہاں جاپان میں اسلامک سرکل کے نظم کے تحت تحریک اسلامی کی دعوت پھیلانے کا کام کر رہے ہیں۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ یہاں اسلامی تحریک کا کام اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک ہمارے ارکان یہاں شادیاں کر کے خود اپنے یہاں قیام کا، اور مسلم معاشرہ کی تشکیل کا اہتمام نہ کریں۔ جاپانی معاشرہ یورپ اور امریکہ کے طرز کا مخلوط معاشرہ ہے۔ لڑکے اور لڑکی کے باہم ملنے جلنے اور واقفیت حاصل کرنے کے بغیر شادی نہیں ہو سکتی۔ خواتین ہمارے ساتھ کام کرتی ہیں۔ بازاروں میں واسطہ پڑتا

ہے۔ ان حالات میں کیا شوریٰ اپنے ارکان کو اس بات کی اجازت یا ہدایت دے سکتی ہے کہ وہ کسی لڑکی سے شادی کرنے کے لیے اس سے مل جل سکتے ہیں، اس کے ساتھ ہوٹلوں اور پارکوں وغیرہ میں گھوم پھر سکتے ہیں۔

آپ کے خیال میں قرآن و حدیث کی روشنی میں اس قسم کی ترغیب ارکان کو دی جا سکتی ہے یا نہیں۔ اس کے کیا نقصانات اور فوائد ہو سکتے ہیں۔

آپ کے مسائل بیشتر ایسے ہیں جن کا جواب ہر انسان کا اپنا ضمیر بہتر دے سکتا ہے۔ میں یا کوئی مفتی آپ کو دین کے احکام بتا سکتا ہے، مکان و زماں اور انفرادی حالات کے لحاظ سے ان میں تغیر و تبدل کے اصول بتا سکتا ہے، لیکن اپنے مخصوص حالات کے لحاظ سے ایک شخص کیا کرے، اس کا فیصلہ وہی بہتر کر سکتا ہے۔ ایسے ہی حالات کے لیے نبی کریمؐ نے فرمایا ہے کہ جس سے دل میں کانٹے کی طرح کھٹک پیدا ہو وہ گناہ ہے، یا یہ کہ اپنے دل سے فتویٰ پوچھو۔ میں آپ کے سامنے چند بنیادی باتیں رکھ سکتا ہوں:

۱۔ عمل کرنے کے لیے آپ ذاتی حیثیت سے اللہ تعالیٰ کے سامنے مسئول ہوں گے۔ کسی شوریٰ کے فیصلہ، کسی تحریکی رہنما کی ہدایت اور کسی مفتی کے فتویٰ سے آپ اپنی مسئولیت سے نہیں بچ سکتے۔ اِلاّیہ کہ آپ بالکل جاہل اور ناواقف ہوں، اور جس کو جاننے والا سمجھتے ہوں اس سے مسئلہ پوچھیں، وہ آپ کو غلط بتا دے، اور آپ اس پر عمل کر لیں۔ ایسی صورت میں لعل (امید ہے کہ) آپ کا عذر اللہ کے ہاں قبول ہو جائے۔ لیکن زیرِ بحث معاملات میں ایسے جاہل اور ناواقف آپ نہیں ہیں۔ آپ بہت کچھ جانتے ہیں، اسی لیے آپ کے دل میں خلش ہے، اور آپ سوال کر رہے ہیں۔

۲۔ اللہ کی نافرمانی کر کے اللہ کی رضا حاصل ہو سکتی ہے، نہ اس کے دین کا کام۔ لیکن اللہ کا حکم کیا ہے اور اس پر حالات کے لحاظ سے عمل کی صورت کیا ہو، یا دو احکام کے معاملہ میں حکم شرعی اور مصلحت شرعی کے تقاضوں میں تضاد ہو تو کیا راہ نکالی جا سکتی ہے، یہ مسائل اپنی جگہ باقی رہتے ہیں۔ مثلاً کوئی یہ کہے کہ جاپان میں تحریک برپا کرنے کے لیے وہاں شادیاں کرنا ضروری ہے، اور وہاں شادی کرنے کے لیے قبل از شادی جنسی تعلق ضروری ہے، تو آپ کا دل خود ہی فتویٰ دے گا کہ اس طرح نہ تحریک برپا ہو سکتی ہے، نہ اللہ خوش ہو سکتا ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ غضِ بصر اور حجاب کے احکام کے باوجود، دوسری طرف، شادی سے پہلے لڑکی کو دیکھ لینے کی نہ صرف اجازت ہے، بلکہ ترغیب ہے۔ اب راہِ صواب ان دو قسم کی صورتوں کے درمیان ترجیح و تطبیق ہی سے نکل سکتی ہے۔

۳۔ بعض منہیات ابدی ہیں، جیسے قتل اور زنا، بعض میں حالات کے لحاظ سے استثنا ہو سکتا ہے۔ مگر اس کے لیے حکمت، حالات، اور شریعت کے مصالح کا صحیح علم و فہم ضروری ہے۔

۴- میرے نزدیک عورت اور مرد کے اختلاط اور حجاب کے سلسلہ میں احکام کی حیثیت حدود کی ہے، اور ان میں حالات کے لحاظ سے سختی اور لچک کی گنجایش ہے۔ اس گنجایش کا صحیح فیصلہ وہی کر سکتا ہے جس کا دل فتویٰ دینے کا اہل ہو، یعنی علم و تقویٰ کا حامل ہو۔

آپ جانتے ہیں کہ پاکستان میں بھی بے حجاب چہرے سامنے آتے ہیں، لڑکیوں کے ساتھ کام کرنا پڑتا ہے۔ جاپان میں تو اس سے مفر ہی نہیں۔ جب آپ وہاں گئے تو بسوں میں ساتھ بیٹھنا ہو گا، دفتروں اور ہوٹلوں میں ساتھ کام کرنا ہو گا، کوئی کام کے سلسلہ میں بات کرنے آئے تو اپنے کمرہ میں آپ کو اس سے تخلیہ میں ملنا ہو گا۔ تخلیہ میں غیر محرم سے ملنے کو میں سخت قابل احتراز سمجھتا ہوں۔ لیکن دفعتاً اخبار کی رپورٹر میرے پاس آتی ہے تو مجھے اس سے اپنے کمرہ میں ملنا پڑتا ہے۔ کوشش کرتا ہوں کہ دروازہ کھلا رہے، یا کوئی اور بیٹھا رہے۔ لیکن ہر وقت یہ ممکن نہیں ہوتا۔ ایسی اور بے شمار صورتیں ہو سکتی ہیں۔ لیکن میں کسی اجنبی عورت کے گھر میں اس کے ساتھ ملوں، اس کے ساتھ کھانا کھاؤں، یا اس سے شادی کی نیت سے تنہائی میں ملوں، یا سیر و تفریح کو جاؤں، تو پھر پیٹنگ (petting) اور نیکنگ (necking) اور اس سے آگے کے دروازے کھلنے کا قوی خطرہ ہے۔ میری رائے میں اس سے دور ہی رہنا بہتر ہے۔ ممکن ہے جاپان میں اسلامی تحریک مستقل نہ قائم ہو سکے، لیکن آپ کے لیے جنم میں مستقل ٹھکانہ بننے کا امکان تو نہیں ہو گا۔ لیکن اگر کسی لڑکی سے آپ کی کام کی جگہ پر روز ملاقات ہوتی ہے، آپ لوگوں کے سامنے کسی پارک میں بیٹھ جاتے ہیں، یا کہیں ریسٹورنٹ میں کھانا کھا لیتے ہیں، تاکہ نکاح کی غرض سے ایک دوسرے سے واقف ہو سکیں، بات چیت سے آگے نہیں بڑھتے، تو اسلامی تحریک کی خاطر، یا اپنے نفس کو حرام سے بچانے کی خاطر، اس چھوٹی برائی کو، استغفار، ندامت اور شرمندگی کے ساتھ قبول کر لینے کا فتویٰ آپ اپنے دل سے لے سکتے ہیں۔

۵- ایک اہم اصول یہ بھی ہے کہ جو برائی ہے وہ برائی ہے۔ کسی نیکی کے لیے، یا بڑی برائی سے بچنے کے لیے، اس کو کرنے کی رخصت تو مل سکتی ہے، لیکن اس کو جائز اور نیکی سمجھ کر نہیں۔ اضطرار کی حالت میں سؤر کا گوشت بھی کھایا جا سکتا ہے، لیکن غیر باغ ولا عاد کی شرط ہے۔

۶- میں آپ کو یہ مشورہ دوں گا کہ آپ تمام اصول لوگوں کے سامنے رکھ دیں۔ ان کو خود اتنا صاحبِ فہم اور صاحبِ تقویٰ بنائیں، ان کے اندر خدا کا خوف اور گناہوں سے بچنے کا داعیہ پیدا کریں، کہ ان کے دل صحیح فتویٰ دیں۔ لیکن میری رائے میں ان معاملات میں تحریک یا شوریٰ کو صاحبِ امر اور صاحبِ فتویٰ کا مقام اختیار نہ کرنا چاہیے۔

یہ صحیح ہے کہ وہاں شادیاں کرنے سے وہاں تحریک پایدار بن سکتی ہے، لیکن یہ فرض نہیں۔ دل کو

پاکیزہ رکھنا بڑا مشکل کام ہے۔ لیکن حدود میں رہ کر ایسا ہو سکے تو کیا حرج ہے۔ تحریک تو جب پایدار ہو گی جب خود جاپانی اسلام قبول کر کے داعی اور مجاہد بن جائیں گے۔ یہ مقصد صرف شادیوں سے حاصل نہ ہو گا۔

۷۔ بہت سوال اور فتوے بھی نہ پوچھا کریں۔ آخر جب آپ دارالمسلمین سے دارالکفر گئے تو آپ نے نہ پوچھا۔ جب آپ نے غیر محرم لڑکیوں کے ساتھ سفر کیا، کام کیا، تو نہ پوچھا' تو اب آپ تحریک، شوریٰ اور ذمہ دار افراد کے سر ذمہ داری کیوں منتقل کریں۔ (خرم مراد)

کتاب نما

اسلامی نظام: ایک فریضہ، ایک ضرورت: از ڈاکٹر یوسف القرضاوی۔ مترجم: محمد طفیل انصاری۔ ناشر: البدر پبلی کیشنز، اردو بازار لاہور۔ صفحات: ۳۱۲۔ قیمت: ۶۰ روپے۔

یہ کتاب عالمِ اسلام کے معروف دانش ور ادیب ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی زیرِ نظر تصنیف "الحل الاسلامی، فریضۃ و ضرورۃ" کا اردو ترجمہ ہے۔ ایک محقق اور مفکر کی حیثیت سے موصوف کا مقام بہت بلند ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے نئی نسل کے ذہنوں سے شکوک و شبہات کے جالوں کو صاف کرنے اور ان کے اسلامی شعور کو بیدار کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ وہ محض ادیب نہیں، دعوتِ دین کے سلسلے میں عملی تجربے سے بھی مالا مال ہیں۔ ان کی تصانیف غلبۂ اسلام کی جدوجہد میں مصروف لوگوں کے لیے، خاص طور قابلِ توجہ رہی ہیں۔ زیرِ نظر کتاب بھی انھی خصوصیات کی آئینہ دار ہے۔

زیرِ نظر کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ مصنف نے اسلامی نظام کے لیے انقلاب کی ضرورت و اہمیت واضح کرنے کے بعد، اسلامی نظام کے خدوخال اور اس کے فوائد بیان کیے ہیں، پھر ان شرائط کا ذکر کیا ہے جنھیں پورا کیے بغیر اسلامی نظام کا قیام ممکن نہیں ہے۔ ان شرائط میں اسلامی حکومت کا قیام، صرف ماخذ اسلام سے استفادہ، پورے دین پر عمل، اسلام پر استقامت، اسلام ہی کو مقصدِ حیات بنانا اور اس کے ذریعے مادی خوشحالی اور دنیاوی سربلندی کے حصول کی کوشش شامل ہیں۔ مختصر یہ کہ فاضل مصنف نے اسلام کو ایک قابلِ عمل اور نتیجہ خیز اجتماعی تحریک کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے۔ ان کے نزدیک اس تحریک میں یہ صلاحیت ہونی چاہیے کہ یہ بتدریج نہ صرف مسلم معاشرے کے اندر اپنی تائید و حمایت اور اثرات کا دائرہ وسیع کرتی جائے بلکہ بیرونی طاقتوں اور قومی جماعتوں کی مخالفانہ سرگرمیوں اور اندرونی کمزوریوں پر قابو پانے کی صلاحیت بھی رکھتی ہو۔ اس ضمن میں ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے ماضی کی اسلامی تحریک کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا جائزہ بھی لیا ہے۔ فاضل مصنف کا انداز عالمانہ اور محققانہ ہے۔ مسائل کے تجزیے میں، عملی طرزِ فکر اور مدلل انداز نے کتاب کی افادیت کو دوچند کر دیا ہے۔

جناب محمد طفیل انصاری نے کتاب کا ترجمہ کر کے ایک اہم علمی و دینی خدمت انجام دی ہے۔ شاید یہ پہلی مبسوط کتاب ہے جسے انھوں نے عربی سے اردو میں نقل کیا ہے لیکن یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انھوں نے ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی ترجمانی میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کی ہے۔ تاہم بعض مقامات پر اصطلاحات کے ترجمے اور اسما کے اندراج میں اجنبیت کا احساس ہوتا ہے، مثلاً ص ۶۹ پر عورتوں کے لیے انگریزی اصطلاح better half کا ترجمہ "بہترین نصف" کیا گیا ہے۔ ص ۱۷۱ پر ٹیکنالوجی کا ترجمہ "تکنیک" کیا گیا ہے۔ ص ۱۸۱ پر میکسم گورکی کو "ماکسیم جورکی" لکھا گیا ہے۔ اسی طرح ص ۱۶۷ پر بالشوزم کو "بالشفیت" کا نام دیا گیا ہے۔ اگر تھوڑی سی مزید توجہ صرف کی جاتی تو زبان و بیان کو بہتر بنایا جا سکتا تھا۔ مترجم نے متعدد مقامات پر مفید حواشی کا اہتمام کیا ہے جو یقیناً لائق تحسین کام ہے۔ اسی طرح اگر بعض عربی عبارات پر اعراب کا اور صفحات ۶۸، ۶۹، ۱۰۵ اور ۱۳۰ وغیرہ پر عربی عبارات کے حوالے دینے کا اہتمام بھی کیا جاتا، تو نہ صرف پیشکش کے اسلوب میں یکسانیت ہوتی بلکہ قارئین کو بھی فائدہ پہنچتا۔ امید ہے کہ دوسرے ایڈیشن میں کتاب کو ان پہلوؤں سے بھی بہتر بنانے کی کوشش کی جائے گی۔

جدید نظریات کی شکست اور اسلامی نظام کی ضرورت : از ڈاکٹر عباسی مدنی، مترجم: خلیل احمد حامدی۔ ناشر: ادارۂ معارف اسلامی منصورہ لاہور۔ صفحات: ۲۰۷۔ قیمت درج نہیں۔

یہ امر واقعہ ہے کہ آج دنیا کی واحد غالب تہذیب مغربی تہذیب ہے جو اپنے بے پناہ مادی وسائل کے بل بوتے پر اپنے اثرات کی ہمہ پہلو توسیع میں بڑی شدت اور مستعدی و چالاکی کے ساتھ سرگرم ہے۔ لیکن مغربی تہذیب کا یہ غلبہ کیا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی اساس حق و راستی پر ہے؟ اور کیا اس نے انسانی زندگی کو حقیقی راحت و مسرت سے ہمکنار کر دیا ہے؟ اسلامک سالویشن فرنٹ الجزائر کے صدر ڈاکٹر عباسی مدنی کی زیر نظر تصنیف اسی سوال کے مختلف پہلوؤں سے بحث کرتی اور اس کا جواب دیتی ہے۔

ڈاکٹر عباسی مدنی مفکرانہ بصیرت کے مالک ہیں۔ انھوں نے علمی انداز میں مغربی تہذیب کا جائزہ لیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ سائنسی دنیا میں غیر معمولی کامیابیاں حاصل کرنے کے باوجود مغرب، انسان کے معاشرتی اور تہذیبی مسائل کا کوئی حل تلاش نہیں کر سکا ہے، بلکہ اس نے زوالِ انسانیت کے دروازے کھول دیے ہیں۔ ڈاکٹر عباسی مدنی کے نزدیک جہاں تک مغربی فضلا کی سائنسی اور مادی کامیابی کا تعلق ہے، اس کا اصل سبب یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تحقیق کو صحیح بنیادوں پر جاری رکھا اور زمین و آسمان

کی وسعتوں میں پھیلے ہوئے حقائق کی دریافت کا فطری طریقہ اپنایا۔ اپنی کاوشوں کے ثمرات سے اس کے نتیجے میں وہ بہرہ ور بھی ہوئے، لیکن تہذیبی اور معاشرتی مسائل میں فطری طریقے سے انحراف نے انھیں روحانی اضطراب میں مبتلا کر دیا، اور ان کی گمراہی کرۂ ارض کے امن و امان کو تباہ کرنے کا باعث بھی بنی۔ ڈاکٹر عباسی مدنی نے اس فاسد رَوِش کی خامیوں کو بڑے مدلل انداز سے واضح کیا ہے۔ ان کے نزدیک انسان کے تہذیبی مسائل اس حکمت کے تحت حل ہو سکتے ہیں، جو انبیا نے اختیار کی اور جس کا اصل ماخذ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

جناب عباسی مدنی کی یہ تصنیف ان کے متوازن فکر کی غماز ہے۔ وہ مغربی فکر کے منفی پہلوؤں کے ساتھ اس کے مثبت پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ اسی طرح اسلامی تہذیب کے اثرات پر بحث کرتے ہوئے وہ امت مسلمہ کی عملی کوتاہیوں کو نظرانداز نہیں کرتے اور اس کو ان ذمے داریوں کا احساس دلاتے ہیں جن سے عہدہ برآ ہوئے بغیر وہ انسانیت کی تعمیر نو میں بھرپور کردار ادا نہیں کر سکتی۔ فاضل مصنف نے اپنے دعاوی کی بنیاد محکم دلائل پر رکھی ہے اور انھوں نے کہیں بھی اپنے مخصوص استدلالی اسلوب کو ترک نہیں کیا۔ ان کا انداز بحث تجزیاتی ہے اور وہ اپنے دلائل کو نہایت مرتب صورت میں پیش کرتے ہیں تاکہ قاری ان سے موزوں نتائج اخذ کر سکے۔

یہ کتاب ظاہری حسن سے بھی مزین ہے تاہم پروف ریڈنگ اور کاپی جوڑنے میں ضروری احتیاط ملحوظ نہیں رکھی گئی۔ توقع ہے کہ الجزائر کے عصری سیاسی تغیرات اور تحریکِ اسلامی کی تازہ پیش رفت کے حوالے سے یہ کتاب دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔ (ڈاکٹر رحیم بخش شاہین)

آپریشن صومالیہ: از رفیق ڈوگر۔ ناشر: دید و شنید پبلی کیشنز لمیٹڈ، لاہور۔ صفحات: ۱۷۶
قیمت: ۱۴۰

پاکستانی فوج امریکا کی رضا حاصل کرنے کے لیے اور بقول جنرل عبدالوحید، پرمسلط ترمیم ہٹانے کے لیے برادر مسلم ملک صومالیہ میں برسرپیکار ہے۔ ایک سنگین واقعے کے بعد ۳۰ لاشیں بھی آچکی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ ہمارے پریس نے اہل وطن کو اس کے دور رَس اور خطرناک مضمرات سے آگاہ نہیں کیا۔ ہماری فوج وہاں موجود ہے اور اس سے مغرب، بلکہ امت مسلمہ کے دشمنوں کے مقاصد پورے ہو رہے ہیں۔ آپ اپنے کسی تعلیم یافتہ نوجوان سے اس بارے میں دریافت کریں تو شاید وہ بالکل کورے نکلیں۔ ایسے میں رفیق ڈوگر کا سفر صومالیہ اور پھر اس موضوع پر پوری کتاب لکھ کر شائع کر دینا نہایت خوشگوار عمل ہے۔ یہاں اس طرح کتابیں لکھنے اور شائع کرنے کی روایت موجود ہوتی

(لیکن اس کا تعلق شاید خواندگی کی شرح سے نکلے) تو جن افریقی ممالک میں ہمارے پڑھے لکھے ہزاروں لوگ برسوں ملازمت کر کے آگئے، ان کے بارے میں درجنوں کتابیں بازار میں دستیاب ہوتیں۔

صومالیہ ایک آزاد مسلم ملک ہے (یا تھا) لیکن ایک آمر نے اسے اس حال کو پہنچا دیا کہ وہاں یو این او کا نام لے کر امریکی افواج آئیں۔ یہ "بہادر افواج" قحط زدہ اور مفلوک الحال لیکن غیرت مند صومالیوں کے ایک ہی ہلے میں واپس چلی گئیں لیکن اپنے مقاصد پورا کرنے کے لیے پاکستانی افواج کو نبرد آزما ہونے کے لیے چھوڑ آئیں۔ یہ نہایت وفاداری سے خدمات انجام دے رہی ہیں اور خوش ہیں کہ راستے میں عمرہ کر لیتے ہیں، اہل خانہ کو کینیا کی سیاحت کا موقع مل جاتا ہے، اور تنخواہ ایک ہزار ڈالر کے بین الاقوامی شرح کے مطابق ۳۰ نہ سہی ۱۲، ۲۰ ہزار روپے تک مل جاتی ہے۔

رفیق ڈوگر نے "عظیم رہبر، عظیم قاتل" کے عنوان سے زیاد برے کے دور اور اس انجام تک پہنچنے کی جو داستان رقم کی ہے، وہ رونگٹے کھڑے کر دینے والی ہے۔ استعمار کے ہاتھوں اور ایجنٹوں کے ذریعے اپنی نام نہاد آزادی کے باوجود یہ مسلمان قوم مظالم سہ سہ کر کس حال کو پہنچ گئی۔

لیکن اصل تصویر تو آپریشن کی ہے جس میں امریکا کے مقاصد اور ہمارا اور ہماری فوج کا کردار کھل کر سامنے آتا ہے۔ صومالیہ کی کوئی انچ زمین تیل سے خالی نہیں۔ اسی طرح یورینیم کے وسیع ذخائر بھی موجود ہیں۔ امریکی کمپنیوں نے اپنی شرائط پر معاہدات کر رکھے ہیں، وہ نہیں چاہتے کہ اپنے ملک کا کوئی خیر خواہ حکمران برسراقتدار آ کر انھیں چیلنج کرے۔ امریکا نہایت عیاری سے مسلمان ملکوں کے درمیان باہمی دشمنی کی دیواریں کھڑی کرتا ہے۔ اسے تو کسی ایک مسلمان ملک کے عوام کے باہمی اتحاد میں بھی خطرہ نظر آتا ہے، چنانچہ ان کو آپس میں لڑانے اور حکومت اور عوام کو لڑا کر ملک کو کمزور کرنے میں پیش پیش ہے۔

مصنف کے بقول "ہمارے حکمران بھی زیاد برے کے نقش پا پر چلے جا رہے ہیں اور اپنے مخالفین کو کچل کر دیوار سے لگانے اور ملکی مفادات کا سودا کر کے امریکا کی تائید و حمایت سے اقتدار پر قابض رہنے کے راستے پر چل رہے ہیں"۔ صومالیہ میں یہ حال ہے کہ ایک حاملہ خاتون، امریکی سپاہی کی گولی سے ہلاک ہوئی جو پاکستانی مورچے سے چلائی گئی تھی۔ ساری دنیا میں پاکستان کی خوب بدنامی ہوئی۔ سب کو حقیقت حال معلوم تھی۔ لیکن ہماری فوج اور حکومت کو وضاحت کرنے کی جرأت نہ تھی۔ مصنف نے واضح کیا ہے کہ کس طرح "ہماری اعلیٰ فوجی کمان اور حکومت نے متعدد مواقع پر بلکہ مسلسل ملکی اور قومی مفادات سے بے نیازی برتی"۔

صومالیہ کا مطالعہ ہم پاکستانیوں کے لیے، ایک مسلمان ملک کے بارے میں استعمار کی پالیسی کو سمجھنے کے لیے غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ کاش کہ مصنف (یہ شاید خود ہی ناشر ہیں) اتنی جاندار تحریر کے حسن

کو، رموزِ اوقاف سے بے نیازی اور پروف کی بے افراط اغلاط سے داغ دار نہ کرتے، اور کاش کہ جہاں انھوں نے اتنی تصاویر دی ہیں، صومالیہ کی جغرافیائی پوزیشن کی وضاحت کے لیے ایک دو نقشے بھی شامل کر دیتے۔

ملک شام کی عظیم الشان فتوحات اور صحابہ کرام کے مجاہدانہ کارنامے: از مولانا فضل محمد۔ ناشر: ادارہ دعوت اسلام، جامعہ یوسفیہ نبویہ شرف آباد، کراچی۔ صفحات ۲۸۰۔ قیمت درج نہیں۔

مصنف نے یہ کتاب واقدی کی بلاد الشام سے اور کہیں کہیں البدایہ والنہایہ کی مدد سے مرتب کی ہے۔ واقدی کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ "واقدی پر فن حدیث میں اگرچہ کلام ہے، لیکن وہ فن تاریخ کا امام اور مستند عند الانام ہے"۔ چنانچہ سرورق پر "ایمان افروز، عام فہم اور مستند تاریخی حقائق" کا ذیلی عنوان دیا گیا ہے۔ آج، جب کہ جہاد کی نئی داستانیں رقم ہو رہی ہیں، اس کتاب کا مطالعہ یقیناً اہل ایمان کا خون گرم کرنے کا باعث ہو گا۔ (مسلم سجاد)

فراہی مقالات: مرتبہ: ادارہ علوم القرآن علی گڑھ۔ ناشر: دار التذکیر، ۲۴۲ علامہ اقبال روڈ نزد پل نہر دھرم پورہ لاہور۔ صفحات: ۳۲۰۔ قیمت درج نہیں۔

قرآن مجید سے متعلق اہم موضوعات پر ۲۶ علمی و تحقیقی مضامین کا یہ مجموعہ، مجلّہ "الاصلاح" میں شائع شدہ مقالات کا ایک انتخاب ہے۔ "الاصلاح" قرآنیات کا اختصاصی رسالہ تھا اور ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۹ء تک مولانا امین احسن اصلاحی کے زیر ادارت شائع ہوتا رہا۔ رسالۂ مذکور کم یاب ہے، اس اعتبار سے ادارۂ علوم القرآن نے زیرِ نظر کتاب کی شکل میں، قرآنیات کے شائقین کو ایک نادر اور گراں قدر علمی تحفہ فراہم کیا ہے۔ مضامین کے عنوانات (ترتیب و نظام قرآن۔ نظم قرآن۔ حروف مقطعات۔ اسماء سور۔ قرآن میں تکرار کی نوعیت اور قصہ آدم و شیطان۔ قرآن مجید اور حج۔ نجات کا قرآنی تصور۔ تقویٰ۔ خلوص۔ لفظ آلاء کی تحقیق۔ اقسام قرآن۔ وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى۔ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ کی صحیح تاویل وغیرہ) اور مقالہ نگاروں (مولانا حمید الدین فراہی، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا اختر احسن اصلاحی، مولانا ابو اللیث اصلاحی ندوی، مولانا بدر الدین اصلاحی اور مولانا حافظ عبد الاحد اصلاحی وغیرہم) کے اسما اور علمی مقام و مرتبے سے، مجموعے کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ادارۂ علوم القرآن نے مضامین کے انتخاب پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ تدوین کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے مضامین کے حوالوں کی تکمیل، احادیث و اشعار کی تخریج اور ضروری حواشی و تعلیقات کا اضافہ بھی کیا ہے۔

جدید مسلم ذہن کے معمار : از صادق حسین طارق۔ ناشر: سعید اینڈ برادرز، پوسٹ بکس ۱۵۵۳، جی پی او، راولپنڈی۔ صفحات: ۲۱۳۔ قیمت ۷۵ روپے۔

مصنف نے قریبی زمانے کی بعض "قابل احترام اور جلیل القدر" شخصیات کے افکار و اعمال کا تعارف اور ان کے کارناموں اور اثرات کا تنقیدی تجزیہ پیش کیا ہے۔ ان میں محمد بن عبدالوہاب، جمال الدین افغانی، سرسید احمد خان، مفتی محمد عبدہ اور علامہ اقبال شامل ہیں۔ مسلمانوں میں مغربی نظریہ قومیت کی اشاعت کے ضمن میں ضیا گوکلپ، مدحت پاشا، کمال اتاترک، سعد زاغلول پاشا، اور کرنل لارنس کا کردار بھی مختصرا زیر بحث آیا ہے۔ اسی طرح سنوسی تحریک، اشتراکیت اور فلسفہ قومیت پر بھی کلام کیا گیا ہے۔

مصنف کا مقصود یہ ہے کہ ایک طرف تو "حقائق" کو سامنے لایا جائے اور دوسری طرف ملت اسلامیہ کے ان "محسنوں کے احسانات" کو اجاگر کیا جائے۔ کوئی شبہ نہیں کہ طارق صاحب بڑی حد تک اپنے مقصد میں کامیاب رہے ہیں۔ انھوں نے زیر بحث شخصیات (و موضوعات) پر ضروری اور مناسب مطالعے کے بعد قلم اٹھایا ہے اور بڑی حد تک معروضی انداز سے بحث کی ہے۔ مصنف کا زاویہ فکر و نظر درست اور خیالات متوازن ہیں، مثلاً یہ کہ محمد بن عبدالوہاب کی دعوت کو سیاسی اغراض کے تحت "وہابیت" کا نام دیا گیا ہے حالانکہ یہ "مسلمانوں میں حقیقی روح پیدا کرنے کی ایک کوشش تھی"۔ سرسید کی اصلاحی کوششوں کے اعتراف کے ساتھ ساتھ، ان کے بعض افکار پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ: "سرسید کی مذہبی زندگی اور مذہبی افکار کا پہلو بہت مشکوک اور مشتبہ ہے"۔ اور: "یہ حقیقت ہمیشہ ان کی نظروں سے اوجھل رہی ہے کہ تاریخ ایسی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے کہ کسی قوم نے غیر ملکی حکومت کے سائے میں ترقی حاصل کی ہو۔ پھر جہاں تک ملت اسلامیہ کا تعلق ہے، اس کی ترقی کا اصل ضامن خود اسلام ہے"۔

بعض مقامات پر مصنف کے نقطہ نظر سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا، مثلاً محمد بن عبدالوہاب کی تحریک کے بارے میں وہ کہتے ہیں: "مسلم ذہن پر اس کا بہت بڑا اثر ہوا ہے۔ مسلمانوں کی عادات و اطوار بدلنے کے لیے اس نے بہت مدد دی ہے۔ آج عبدالوہاب کو برا بھلا کہنے کے باوجود بھی لاشعوری طور پر لوگ ان کے پیروکار ہیں۔ عوام قبر پرستی سے دور ہو چکے ہیں اور حقیقی خیالات اور عقائد کی پیروی کرنے لگے ہیں"۔ ہمارے خیال میں یہ بات حالات و حقائق کے خلاف ہے۔ اسی طرح اشتراکیت کے متعلق یہ کہنا کہ اس سے: "مسلم دنیا کو تقویت ملی ہے (اور) وہ اپنی جدوجہد آزادی کو تیز کر سکی ہے" غلط فہمی پر مبنی ہے، بلکہ اشتراکیت کے بارے میں تو مصنف کے خیالات میں تضاد بھی ملتا ہے۔ ایک جگہ تو وہ لکھتے ہیں کہ: "اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اشتراکیت سے اسلام کو کوئی خطرہ ہے؟ یقیناً ہمیں اس سے کوئی خطرہ نہیں

ہے" (ص ۱۴۰)، مگر چند صفحات بعد لکھتے ہیں: "ایک ایسا وقت ضرور آنا ہے کہ اشتراکیت اسلام کے خلاف نبرد آزما ہو جائے گی، لہٰذا اس وقت کے لیے مسلمانانِ عالم کو تیار رہنا ہو گا" (ص ۱۴۵)۔ ترکی کے "عظیم محسن اور دنیا کی عظیم شخصیت" کمال اتاترک پر مصنف کا نقد و انتقاد بس اس ایک جملے تک محدود رہا ہے کہ "ترک ناداں نے مسلمانوں کی مرکزیت کو پارہ پارہ کر دیا" (ص ۱۴۰)۔ علامہ اقبال کے سوانحی خاکے میں بھی متعدد واقعاتی غلطیاں موجود ہیں۔

کتابت و طباعت اوسط معیار سے بھی فروتر ہے۔ ترتیب و تدوین کی بعض خامیاں بھی کھٹکتی ہیں۔ کئی حوالے نامکمل اور چند ایک ندارد۔ کہیں کہیں عبارت نظرثانی کی محتاج ہے، مگر بحیثیت مجموعی صادق حسین طارق کی یہ کاوش خوش آیند اور قابل قدر ہے۔

لہو رنگ پلکیں: از محمد افتخار۔ ناشر: البدر پبلی کیشنز اردو بازار لاہور۔ صفحات: ۷۹۔ قیمت ۱۸ روپے۔

یہ کتاب کشمیر کی حالیہ تحریک آزادی کے حوالے سے، سکول کے بچوں کے لیے چھوٹی چھوٹی سات کہانیوں کا مجموعہ اگرچہ سپاٹ واقعات پر مشتمل ہے، مگر جذبۂ جہاد سے سرشار کشمیری بچوں اور نوجوانوں کے کردار، جدوجہد آزادی میں والہانہ انداز میں حصہ لیتے نظر آتے ہیں۔ اس نوع کی کتابوں میں زبان و اسلوب اور املا پر خاص توجہ دینی چاہیے۔

سیرت حضرت عبداللہ بن عمرؓ: از ابن عبدالشکور۔ ناشر: دعوت اسلام سنٹر بنگلور، بھارت۔ صفحات: ۴۰۰۔ قیمت: ۶۰ روپے۔

مولف نے حضرت عمرؓ کے فرزند اور جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہؓ کے حالات و فرمودات مختلف ماخذات سے یکجا کیے ہیں۔ یہ ایک مربوط سوانح عمری تو نہیں بن سکی، مگر مولف نے اس موضوع پر مفید مواد جمع کر دیا ہے۔ (رفیع الدین ہاشمی)۔

وضاحت

۱۔ ترجمان القرآن میں ترجیحاً دینی اور علمی کتابوں پر تبصرے شائع کیے جاتے ہیں۔

۲۔ تبصرے کے لیے کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں۔

۳۔ تبصرے کے لیے مطبوعات براہ راست: مدیر ترجمان القرآن منصورہ، لاہور ۵۴۵۷۰ کو بھیجی جائیں۔

مدیر کے نام

اعجاز احمد - ملتان

آبادی (نومبر ۹۴) میں بہت صحیح نشاندہی کی گئی ہے کہ مسئلہ اضافہ آبادی نہیں۔ ہماری ضرورت ایسی قیادت ہے جو منفی نہیں، مثبت سوچ کی حامل ہو اور انسانی وسائل کے خزانوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے منصوبہ بندی کرے۔

عدی محمد - کراچی

سفر کریں تو بڑے بڑے قطعات اراضی غیر آباد نظر آتے ہیں۔ انھیں آباد کرنے کے لیے انسانوں ہی کی تو ضرورت ہے۔

قمر میمن - شکارپور

ہماری سب سے بڑی بدقسمتی وہ حکمران ہیں جو تعمیر و ترقی کے لیے اپنے مالی اور انسانی وسائل پر انحصار کرنے کے بجائے غیر ملکی آقاؤں کی طرف دیکھتے ہیں، اور پھر ان ہی کے مفادات پورا کرنے کے لیے قومی پالیسیاں تشکیل دیتے ہیں۔ بلکہ اب تو کسی شرم کے بغیر ان ہی سے بنواتے ہیں۔ برتھ کنٹرول کی مہم اسی صورت حال کو ظاہر کرتی ہے۔

شمس الدین - سکھر

مولانا ملک غلام علی کی یاد میں (نومبر ۹۴) مضامین سے ان کے حالات زندگی کا تو پتا چلتا ہے، لیکن ایک انسان کی حیثیت سے ان کے کردار کی روزمرہ جھلکیاں سامنے نہیں آتیں۔ ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والوں کو اس پہلو پر بھی قلم اٹھانا چاہیے۔

نوزور جان - پشاور

شرعی عدالت کے جج کی حیثیت سے مولانا ملک غلام علی صاحب نے جو فیصلے لکھے ہیں انھیں یک جا شائع کیا جانا چاہیے۔

محمد طارق محمود، ملتان

ترجمان القرآن میں مرحومین کی تحریریں تو بڑے اہتمام سے شائع ہوتی ہیں اور یہ ہیں بھی بہت مفید، لیکن عصرِ حاضر سے برسرِپیکار زندہ اہلِ قلم کی زندگی آموز نگارشات سے ہم اکثر محروم رکھے جا رہے ہیں۔ کسی اسلامی ملک کی صورتحال سے آگاہ فرمائیں کہ وہاں کی سیکولر اور مذہبی جماعتوں اور سیاست کے بارہ میں معلومات حاصل ہوں۔

محمد صدیق ظفر۔ لاہور

ماشاءاللہ، ترجمان القرآن خوب ترقی کر رہا ہے۔ جنوری سے آپ نے تزئین نو کا آغاز کیا تھا، اب دسمبر ہے، جائزہ لیجیے کہ اس پورے عرصے میں کون سا موضوع نظرانداز ہوا۔ ۱۹۹۵ سے کیا یہ ممکن ہو گا کہ ہر ماہ کسی اہم مسئلہ پر تین چار علما کی رائے آجایا کرے۔

طغرل ارسلان۔ کمالیہ

ترجمان القرآن کے مضامین کا تنوع قابل ستایش ہے۔ قرآن مجید کی ترجمانی کا حصہ قدرے کم ہے۔ عصر حاضر کے تفسیری رجحانات کی نشاندہی فرمائیں۔ قرآن پر گزشتہ بیس تیس برسوں میں مستشرقین نے جو کام کیا ہے، کیا اس کا جائزہ بھی آپ دیں گے۔

غضنفر علی ضیغم نقوی۔ جھنگ

بشیر جمعہ صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ وہ لکھنا بند نہ کریں۔ اہل اللہ کے رمضان المبارک کے قیمتی لمحات کا تذکرہ ترجمان القرآن میں آنا چاہیے۔ ملک غلام علی مرحوم کی یاد میں لکھے گئے مضامین بہت عمدہ ہیں۔ ان میں مرحوم کی علمی خدمات کا جائزہ نہیں آسکا۔

عثمان حسن عمر ۔ فیصل آباد

تمام مضامین اچھے ہیں۔ البتہ قرآن کا گوشہ نظر نہیں آیا۔ کیا فہم قرآن کے حوالے سے ہر ماہ کوئی تحریر دی جا سکتی ہے' خواہ ایک صفحہ ہی ہو۔

محمد عبداللہ حسین ۔ لاہور

شاہ ولی اللہ اور حافظ ابن قیم کے افادات لائق مطالعہ ہیں، ایسی اور بھی علمی شخصیتوں کے افادات شائع ہونے چاہئیں۔ حکمت مودودی کے صفحات بڑھا دیں اور حالات حاضرہ سے متعلق مولانا مرحوم کی تحریروں کا انتخاب دیں تو کارکنوں کے علاوہ عام قارئین کے لیے بھی استفادہ کی چیز ہو گی۔ ۶۰ سال پہلے کے عنوان سے ترجمان القرآن میں سے جو ایک صفحہ دیا جاتا ہے' اسے بھی مولانا مودودیؒ کی تحریروں کا حامل ہونا چاہیے۔

اشاریہ : ترجمان القرآن ۱۹۹۴

مرتبہ : رفیع الدین ہاشمی

مصنف / مرتب مترجم / مبصر	عنوان / موضوع	شمارہ	صفحات
اشارات			
خرم مراد	[مستقبل اسلام کا ہے۔ ترجمان کا دورِ نو]	جنوری	۳-۱۷
"	[فساد فی الارض اور امت مسلمہ کی ذمہ داریاں]	فروری	۳-۱۳
"	[وحدت ملی اور اختلاف کی حدود]	مارچ	۳-۱۴
"	[پاکستان کا سیاسی منظر، قاضی حسین احمد بطور نومنتخب امیر]	اپریل	۳-۱۰
"	[بجٹ حکومت پاکستان ۹۵-۱۹۹۴]	جولائی	۳-۱۴
"	[پاکستان امریکا تعلقات]	اگست	۳-۲۵
"	[جماعت اسلامی کی حکمت عملی میں اصلاح معاشرہ کا مقام		
"	ترجمان کے انتظامی مسائل]	اکتوبر	۳-۱۳
"	[جماعت اسلامی : اصلاح معاشرہ کی شرائط اور پروگرام]	نومبر	۳-۱۴
خرم مراد	[جماعت اسلامی : اصلاح معاشرہ اور حکمت نبوی]	دسمبر	۳-۱۳
خورشید احمد، پروفیسر	[مسئلہ کشمیر]	جون	۳-۲۰
"	[مسئلہ کشمیر]	مئی	۳-۲۲
مودودی، ابوالاعلیٰ	[ترجمان القرآن کے پرانے شماروں سے انتخاب]	ستمبر	۳-۱۷
۶۰ سال پہلے			
محمد ادریس کاندھلوی	[لفظ "رحمٰن" اور "رحیم" کی تشریح]	اکتوبر	۱۵
مناظر احسن گیلانی	[مسلمانوں کے لیے ارتداد کا خطرہ]	جون	۲۹
مودودیؒ، ابوالاعلیٰ	[مساوات مرد و زن]	جنوری	۲۱-۲۲
	[فاتحہ ترجمان القرآن کی ترتیب]		۱۹-۲۰
	[آزادی تحریر و تقریر]	فروری	۱۵-۱۶

حکمت مودودی

فہم قرآن

کی وسعتوں میں پھیلے ہوئے حقائق کی دریافت کا فطری طریقہ اپنایا۔ اپنی کاوشوں کے ثمرات سے اس کے نتیجے میں وہ بہرہ ور بھی ہوئے، لیکن تہذیبی اور معاشرتی مسائل میں فطری طریقے سے انحراف نے انھیں روحانی اضطراب میں مبتلا کر دیا، اور ان کی گمراہی کرۂ ارض کے امن و امان کو تباہ کرنے کا باعث بھی بنی۔ ڈاکٹر عباسی مدنی نے اس فاسد روش کی خامیوں کو بڑے مدلل انداز سے واضح کیا ہے۔ ان کے نزدیک انسان کے تہذیبی مسائل اس حکمت کے تحت حل ہو سکتے ہیں، جو انبیا نے اختیار کی اور جس کا اصل ماخذ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

جناب عباس مدنی کی یہ تصنیف ان کے متوازن فکر کی غماز ہے۔ وہ مغربی فکر کے منفی پہلوؤں کے ساتھ اس کے مثبت پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ اسی طرح اسلامی تہذیب کے اثرات پر بحث کرتے ہوئے وہ امت مسلمہ کی عملی کوتاہیوں کو نظر انداز نہیں کرتے اور اس کو ان ذمے داریوں کا احساس دلاتے ہیں جن سے عہدہ برآ ہوئے بغیر وہ انسانیت کی تعمیر نو میں بھرپور کردار ادا نہیں کر سکتی۔ فاضل مصنف نے اپنے دعاوی کی بنیاد محکم دلائل پر رکھی ہے اور انھوں نے کہیں بھی اپنے مخصوص استدلالی اسلوب کو ترک نہیں کیا۔ ان کا انداز بحث تجزیاتی ہے اور وہ اپنے دلائل کو نہایت مرتب صورت میں پیش کرتے ہیں تاکہ قاری ان سے موزوں نتائج اخذ کر سکے۔

یہ کتاب ظاہری حسن سے بھی مزین ہے تاہم پروف ریڈنگ اور کاپی جوڑنے میں ضروری احتیاط ملحوظ نہیں رکھی گئی۔ توقع ہے کہ الجزائر کے عصری سیاسی تغیرات اور تحریک اسلامی کی تازہ پیش رفت کے حوالے سے یہ کتاب دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔ (ڈاکٹر رحیم بخش شاہین)

آپریشن صومالیہ : از رفیق ڈوگر۔ ناشر: دید و شنید پبلی کیشنز لمیٹڈ، لاہور۔ صفحات: ۱۷۶۔ قیمت: ۱۴۰

پاکستانی فوج امریکا کی رضا حاصل کرنے کے لیے اور بقول جنرل عبد الوحید، پر مسلم ترمیم بنانے کے لیے برادر مسلم ملک صومالیہ میں برسرپیکار ہے۔ ایک سنگین واقعے کے بعد ۳۰ لاشیں بھی آ چکی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ ہمارے پریس نے اہل وطن کو اس کے دوررس اور خطرناک مضمرات سے آگاہ نہیں کیا۔ ہماری فوج وہاں موجود ہے اور اس سے مغرب، بلکہ امت مسلمہ کے دشمنوں کے مقاصد پورے ہو رہے ہیں۔ آپ اپنے کسی تعلیم یافتہ نوجوان سے اس بارے میں دریافت کریں تو شاید وہ بالکل کورے نکلیں۔ ایسے میں رفیق ڈوگر کا سفر صومالیہ اور پھر اس موضوع پر پوری کتاب لکھ کر شائع کر دینا نہایت خوشگوار عمل ہے۔ یہاں اس طرح کتابیں لکھنے اور شائع کرنے کی روایت موجود ہوتی

احادیث

اسوۂ حسنہ

تزکیہ و تربیت

اسلامی تحریکیں، عالم اسلام

پاکستانیات

شخصیات

رسائل و مسائل

متفرق

کتاب نما

آپ کی توجہ کے لیے

جنوری ۱۹۹۵ سے ترجمان القرآن کی قیمت۔۔ /۱۲ روپے اور زر سالانہ۔۔ /۱۲۰ روپے ہو گی۔ لیکن جو حضرات ۱۵ دسمبر ۱۹۹۴ تک نئے خریدار بنیں گے یا جو خریدار ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ تک اپنا زر سالانہ وی پی کے بجائے نقد / ڈرافٹ / منی آرڈر بھیج دیا کریں گے ان کے لیے زر سالانہ۔۔ ۱۱۰ روپے ہو گا۔

ترجمان القرآن کے انتظامی امور کے دفتر کا نیا پتہ یہ ہے۔

۵۔ اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور

فون نمبر۔ سرکولیشن، ۷۵۸۷۹۱۶ ۔ انتظامی امور، ۷۵۸۵۵۹۰

احباب پارک
ملتان روڈ لاہور

گلشن احباب
فیز I ملتان روڈ لاہور

گلشن احباب
فیز II لنک فیروزپور روڈ لاہور

منظر کوہسار
اسلام آباد

شاداب کالونی
فیروزپور روڈ لاہور

پانچ رہائشی منصوبوں کی شاندار کامیابی کی حامل اور آپ کے کامل اعتماد کی مظہر

احباب ہاؤسنگ سوسائٹی (پرائیویٹ) لمیٹڈ

اسلام آباد سے متصل مرگلہ ہلز کے
حسین دامن میں ایک نیا دلپذیر شہر

منظر کوہسار

ترقیاتی کام جاری ہیں

ہاؤسنگ اینڈ فزیکل پلاننگ حکومت پنجاب اور
ڈسٹرکٹ کونسل راولپنڈی سے منظور شدہ سڑکیں
سیوریج، بجلی، پانی، سکول، کمیونٹی سنٹر، قبرستان
مسجد اور ہسپتال، خوبصورت جھیل

۳۱ جولائی تک رعایتی قیمت پر
سولہ ہزار روپے فی مرلہ معہ ترقیاتی اخراجات
باقی رقم تین سال کی قسطوں میں،
تین ہزار روپے فی مرلہ کا ڈرافٹ بھیج کر
بکنگ کرالیں پلاٹ ۲ کنال ۱۰ مرلہ
۵ مرلہ۔ کنال = ۶۰۰ مربع گز
خصوصی رعایت سے فائدہ اٹھائیں۔

فیروزپور روڈ پر چونگی امرسدھو سے ۲ کلومیٹر

ایل ڈی اے سے منظور شدہ

شاداب کالونی

کشادہ سڑکیں، خوبصورت پارکیں، مسجد، ڈسپنسری،
سکول۔ مارکیٹیں، ٹیلیفون اور سوئی گیس کی سہولت
موجود۔ سکول کالج اور بڑے ہسپتال قریب تر
ترقیاتی کام جاری ہیں۔ کنال = ۵۰۰ مربع گز

قیمت ۲۰ ہزار روپے فی مرلہ معہ ترقیاتی اخراجات
ایک ہزار روپے فی مرلہ کی رعایت
۳۱ جولائی تک بڑھا دی گئی ہے۔
۳ ہزار روپے فی مرلہ کے حساب سے بکنگ کرائیں
باقی رقم تین سال کی آسان قسطوں میں
پمفلٹ مفت منگوائیے۔

گلشن احباب فیز II لنک فیروزپور روڈ میں کمرشل پلاٹوں کی بکنگ جاری ہے

شاداب کالونی فیروزپور روڈ میں کمرشل پلاٹوں کی بکنگ جاری ہے

تحریک اسلامی سے
وابستہ افراد کا با اعتماد ادارہ

احباب ہاؤسنگ سوسائٹی پرائیویٹ لمیٹڈ

شریف چیمبر 68 مزنگ روڈ لاہور فون 6361501-6368005-304754 فیکس 6369520

احباب ہاؤسنگ

REGD. NO. L 5340

PHONE : 7234014 7236665

MONTHLY TARJUMAN-UL-QURAN LAHORE